انقلاب دہلی

داغ



مجروح



سودا



غالب



حالی



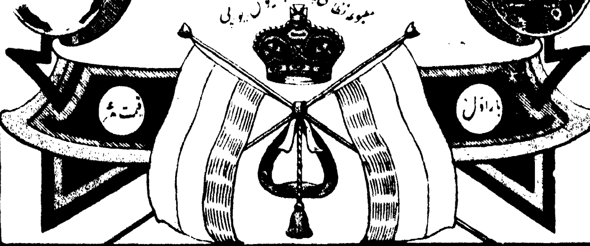
ظفر



لال قلعہ دہلی

اُن نظموں کا مجموعہ جو دہلی کی بربادی پر پڑھی گئیں

مطبوعہ نظامی پریس بدایوں یو پی



قیمت ۸

بار اول

فریادِ دہلی

معروف بہ

انقلابِ دہلی

مرتبہ

نظامی بدایونی

سنہ ۱۹۳۱ء



مقدمہ کتاب انقلاب دہلی

(مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلوی کے قلم سے)

تصویر حروف

یعنی

مختصر مقدمہ انقلاب دہلی

اللہ کی حمد و ثنا کے بعد بندہ کو یہ لکھنا ہے کہ جناب مولانا نظام الدین حسین نظامی ساکن بدایوں شریف اخبار ذوالقرنین کے ایڈیٹر اور مشہور و نفیس کتابوں کے شایع کرنے والے نے ایک نہایت ضروری اور مفید کتاب تیار کی ہے جس کو میں تاریخ انقلاب دہلی تصور کرتا ہوں۔

مولانا کو تاریخ سے خاص دلچسپی معلوم ہوتی ہے ان کے اخبار کا نام اسکی شہادت دیتا ہے۔ مگر یہ کتاب تاریخ بھی ہے۔ مرثیہ اور نوحہ بھی ہے۔ نظم و نثر کا ایک عمدہ گلدستہ بھی ہے اور آنے والی نسلوں کے لیئے ان کی تہذیب کی تصویر بھی ہے جو

کچھ مٹ گئی اور باقی مٹ رہی ہے۔

بدایوں اور دہلی کا تعلق ساڑھے چھ سو برس کا پُرانا تعلق ہے۔ کیونکہ بدایوں نے اپنا ایک لال (حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ محبوب الٰہیؓ) دہلی کو اس وقت دیا تھا جب دہلی میں فاتح ہندوستان سلطان شہاب الدین محمد غوری کے غلام حکومت کر رہے تھے۔ اور دہلی اسلامی شہنشاہیت کا دل اور بدایوں قبۃ الاسلام تھا۔

لیکن یہ کتاب اُس زمانہ کو یاد دلاتی ہے جب غلاموں کے بعد خلجی آچکے اور خلجیوں کے بعد تغلقوں کا زمانہ بھی ختم ہوا۔ اور سید پھر لودی بھی حکومت کرچکے اور تیمور و بابر نے مغلیہ سلطنت کی بنیاد بھی ڈال لی۔ اور ان کے خاندان کا زوال بھی کمال کو پہونچ گیا۔

یعنی ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ آخری شہنشاہ دہلی کے زمانہ کی باتیں ہیں ۱۸۵۷ء کے مشہور غدر کی حکائتیں ہیں۔

یہ زمانہ مسلمانوں کی حکومت اور مسلمانوں کی تہذیب اور مسلمانوں کی ہر چیز کے ختم ہونے کا زمانہ تھا۔ اور ایسا انقلابی زمانہ تھا کہ اس کے بعد مسلمانوں کی رزم خاموش ہوگئی اور بزم کے چراغ گل ہوگئے۔ اور ان کی ہر اُمنگ تھک کر بیٹھ گئی۔

کتاب انقلاب دہلی میں طرح طرح کے خیالات اور طرح طرح کے جذبات جمع ہیں اور ان میں سے ہر چیز مٹی کا ایک موٹام معلوم ہوتی ہے۔ موٹام مٹی کے اس مینار کو کہتے ہیں جو کسی جگہ سے مٹی کھودنے کے بعد پیمایش کے لیے نمانے سے چھوڑ دیئے جاتے ہیں تاکہ معلوم ہو کہ یہاں سے کتنی مٹی کھد گئی۔

اس کتاب کے مضامین بھی ظاہر کرتے ہیں کہ کہاں کہاں کتنی کتنی مٹی تھی اور اب وہ کتنی کھد گئی ہے۔

میں نے غدر دہلی ۱۸۵۷ء کی تاریخ کے ۱۲ حصے لکھے ہیں مگر جو عمدہ موثر لاجواب یا کمیاب چیزیں مولانا نظامی نے اس کتاب میں جمع کی ہیں ان کا میری کتابوں میں نام و نشان بھی نہیں ہے۔

یہ ایک کتاب کا مقدمہ ہے۔ مقدمہ میں مدعی کی ضرورت ہے مگر کتاب "انقلاب دہلی" مدعی بھی خود ہے اور مدعا علیہ بھی آپ ہی ہے۔ اور حاکم و وکیل بھی خود ہی ہے۔ کیونکہ اس میں ایک ایسی قوم اور اس کی حکومت و تہذیب کی بربادی کا ذکر ہے جس کے آج کل سب ہی مدعی و مخالف بن گئے ہیں۔ آسمان کی گردش پہلے صرف شاعروں کی مخالف تھی مگر اب وہ فقط مسلمانوں کی دشمن ہے۔

ذوالقرنین کے ایڈیٹر صاحب کو مسلمانوں کی آئندہ نسل ہمیشہ شکریہ سے یاد کرے گی کہ اُنھوں نے یہ بہت ہی عمدہ چیز اُردو لٹریچر میں تیار کر دی۔ اگر کبھی مسلمان قوم میں کوئی اچھا انقلاب آیا تو اس قسم کی کتابوں کو اقبال کی نظموں اور حضرت اکبر الہ آبادی کے شعروں اور حسن نظامی کی نوحہ نما تحریروں کے پاس ہی جگہ دی جائے گی اور ان کو عمدہ انقلاب کا ذریعہ اور باعث قرار دیا جائیگا۔
میں نے مقدمہ لکھ تو دیا مگر یہ لکھنا مقدمہ کا لکھنا نہیں ہے بلکہ دل کی اور کلیجہ کی دبی ہوئی آہوں کو بزم کاغذ میں نمودار کرنا ہے۔

حسن نظامی

۱۵ر فروری ۱۹۳۱ء۔ دہلی

۷۸۶

انقلابِ دہلی کی تمہید

(مرتب کے قلم سے)

بننا بگڑنا دہلی کی قسمت میں لکھا ہے خدا جانے وہ کتنی مرتبہ بگڑی اور کتنی دفعہ بنی تاریخ کی کتابیں تو ان انقلابات سے بھری پڑی ہیں لیکن اُردو ادب کے صفحات میں بھی ان واقعات کی جھلک نمایاں ہے۔ نادر شاہی حملے سے دہلی کی بربادی پر سوداؔ[1] نے جو مرثیہ لکھا تھا آج بھی وہ اُردو شاعری کی دُنیا میں مشہور ہے۔ دہلی کے جلیل القدر بادشاہ عالمگیر اورنگ زیب کے بیٹوں اعظم و معظم کی خانہ جنگی کا نوحہ[2] جو آج سے سوا دو سو سال قبل جبکہ اُردو شاعری بلکہ اُردو زبان کی شیرخوارگی کا عالم تھا لکھا گیا تھا اور جو جعفر زٹلی جیسے مشہور شاعر کے دل پر چوٹ لگنے کا نتیجہ ہے آج تک یادگار ہے۔ سب سے آخری ضرب

---

[1] سوداؔ کی یہ تین نظمیں اس کتاب کے آخر میں صفحہ ۱۰۹ پر درج ہیں۔

[2] جعفر زٹلی کے اس نوحہ کے اشعار جو قدیم اُردو کا نمونہ ہیں حسب ذیل ہیں

کہاں اب پائیے ایسے شہنشاہ ❊ مکمل کامل و اکمل دل آگاہ

رکت کے آنسو دل بگ بگ روتا ہے ❊ نہ میٹھی نیند کوئی سوتا ہے

صدائے توپ و بندوق است ہر سو ❊ سراسر بانگِ صندوق است ہر سو

دوا دو ہر طرف بھاگڑ پڑی ہے ❊ بچہ در گود سر گٹھیا دھری ہے

کماکٹ و لٹالٹ ہست ہر سو ❊ جھٹا جھٹ بھٹا بھٹ است ہر سو

بہر سو مار مار و دھار دھار است ❊ اوچل چال و تیر خنجر کنار است

جو دہلی کی امن پر پڑی وہ ۱۸۵۷ء کی زد تھی۔ دہلی کی یہ بربادی ایسی نہ تھی کہ اُس وقت کے شعرا خاموش بیٹھتے۔ غدر کی مصیبت جن لوگوں کی آنکھوں کے سامنے گزری تھی اُنھوں نے ان واقعات کے بیان کرنے میں خوب خوب زور قلم دکھایا ہے۔ مرزا غالب نے تو اپنے روزمرہ کے خطوط میں بھی جابجا یہی دکھڑا رویا ہے ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا" ایک خط میں فرماتے ہیں "یہاں اغنیا اور امرا کی ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور میں دیکھوں اس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیئے" ایک دوسرے خط میں تحریر ہے "جامع مسجد کے گرد پچیس پچیس فٹ گول میدان نکلے گا دکانیں حویلیاں ڈھائی جائیں گی دارالبقا فنا ہو جائے گا۔ رہے نام اللہ کا"

غالب نے نظم کے ذریعہ سے بھی ان جذبات کا کچھ کم اظہار نہیں کیا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے   گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا

ذیل کے قطعہ بند اشعار میں بھی مرزا نے لٹی کھسٹی دہلی کی ہو بہو تصویر کھینچ دی ہے ؎

ایک اہل درد نے سنسان جو دیکھا قفس   یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب

بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے   یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

غالب کے سوا اس عہد کے دوسرے شعرا سے بھی ضبط نہ ہو سکا۔ آرزدہ۔ داغ حالی۔ سالک۔ افسردہ۔ شیفتہ۔ صابر۔ ظہیر۔ عیش۔ مجروح جیسے مشاہیر شعرا کے علاوہ ایسے لوگوں نے بھی بدنصیب اور اُجڑی پچھڑی دہلی کے مرثیے لکھے فن شعر میں جن کو شغف نہ تھا اور جن سے اس مرثیے کے سوا دوسرا کلام یادگار نہیں۔ اور تو اور تشنہ جیسے آزاد منش شاعر بھی جنھیں سچ مچ اپنے تن بدن کا بھی ہوش نہ تھا اس طرح پکار اُٹھے ؎

تمام شہر تلنگوں نے آکے لوٹ لیا   مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آکے لوٹ لیا

شیفتہ نے شہر آشوب لکھنے کے علاوہ اپنے دیوان میں بھی دلی کی بربادی کا مختلف اشعار میں ذکر کیا ہے مثلاً ؎

ویرانے کی مانند کہیں دل نہیں لگتا   ہر چند کہ ہے شیفتہ دلی وطن اپنا

۱۸۵۷ء کے عبرتناک واقعہ کو تقریباً پون صدی کا عرصہ گزر چکا ہے اس لیئے آج تہتر سال کے بعد اُن تمام نظموں کو جو اس واقعہ سے متاثر ہو کر لکھی گئیں جمع کرنا مشکل تھا لیکن پھر بھی چھیالیس شاعروں کی چونسٹھ نظمیں کمال جستجو سے دستیاب ہوئیں جن کو ہم نے ان اوراق میں جمع کر دیا ہے۔ یہ نظمیں شعرا کے تخلص کے لحاظ سے بہ ترتیب حروف تہجی درج کی گئی ہیں جن شعرا کا سن ولادت و وفات اور کچھ حال معلوم ہو سکا ہے وہ بھی لکھ دیا ہے ان چھیالیس شاعروں میں دو ہندو شعرا کے نام بھی ملتے ہیں جنھوں نے دہلی کے اُجڑنے کا ماتم مسلمانوں سے کم نہیں کیا ہے۔ منشی رام پرشاد ظاہر دہلی میں اسلامی سلطنت کا مرثیہ پڑھتے ہوئے بادشاہان اسلام کو اس طرح روئے ہیں ؎

بارِ منت سے بھلا کس کا نہیں سر نیچا   کس کے سر پر نہیں احسانِ شہانِ دہلی

منشی رام پرشاد ظاہر نے دہلی کے شاہان اسلام کی نسبت اپنا یہ خیال جس وقت ظاہر کیا تھا یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ان بادشاہوں کی حکومت کا خاتمہ ہو چکا تھا اور اس حکومت کا وہ چراغ بھی جو برائے نام قلعہ کے اندر ٹمٹما رہا تھا گل ہو چکا تھا اس لیئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ شاعر نے جو کچھ کہا اُس میں خوشامد یا چاپلوسی کا شائبہ ہے بلکہ فی الحقیقت اُس نے ایک واقعہ کو نظم کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان بادشاہوں کو موجودہ زمانہ کے بعض غیر مسلم مصنفین جس رنگ میں پیش کرتے ہیں اور جو رنگ ہمارے

؎ ۱۳۰۲ھ میں خان دہلی ایک کتاب شایع ہوئی تھی جو اب نایاب ہے اس سے بہت مدد ملی۔

نوجوانوں کے قلوب کی صاف و شفاف تختیوں پر نفاق اور شقاق کے نقوش مرتسم کرتا ہی وہ حقیقت سے کوسوں دور ہی۔ ایک اور واقعہ سے بھی اس بات کا پتہ چلتا ہی کہ پچھلے مسلمان بادشاہوں پر جبر و تعدی وغیرہ رواداری کا جو الزام لگایا جاتا ہی وہ نہ صرف غلط ہی بلکہ حالت اُس کے برعکس تھی۔ کہا جاتا ہی کہ ۱۸۵۷ء میں فوجوں میں جب بغاوت شروع ہوئی تو ہر مذہب و ملت کے سپاہی اپنی اپنی چھاونی میں آگ لگا کر دہلی کے معزول بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کی طرف دوڑ پڑے ہندو سپاہی بجائے اس کے کہ کسی ہندو راجہ کی طرف متوجہ ہوتے غریب بے بس بہادر شاہ کی جے پکارنے لگے۔

اِن نظموں پر نظر ڈالنے سے اس امر کا بھی پتہ چلتا ہی کہ دہلی پر خون کے آنسو صرف دہلی والوں ہی نے نہیں بہائے ہیں بلکہ دوسرے مقامات کے لوگ بھی اس کی بربادی سے متاثر تھے جیسا کہ بجنور، پانی پت اور لکھنؤ کے شعرا کی نوحہ پڑھنے سے ظاہر ہوتا ہی۔ لطف لکھنوی نے دہلی کے عالمگیر ماتم کا اظہار اپنے لفظوں میں اس طرح کیا ہی ؎

اُٹھ گیا لطفِ محبت نہ رہا دل کو قرار کون ہی جس کو نہ پہونچا ہو تکانِ دہلی

دہلی والوں کے رنج و ملال کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں ایک دہلوی شاعر نے شدتِ غم سے تنگ آکر طنزاً یہ کہہ دیا کہ دہلی مٹ گئی اچھا ہوا اور صرف اسی مضمون کو ایک مطلع میں کھپا کر چپ سادھ لی۔ فرماتے ہیں ؎

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی
کس کی پاپوش بنے مرثیہ خوانِ دہلی (راقم)

دلی کے شعرا نے جہاں عزت آبرو مال دولت سلطنت حکومت محل دو محلوں کی لوٹ کا رونا رویا ہی اُسی کے ساتھ اپنی زبان کی بربادی کی کچھ کم مرثیہ خوانی نہیں کی ہی

شاید ہی کوئی نوحہ ایسا نکلے گا جس میں دلّی کی پیاری زبان کے بگڑنے کا افسوس نہ کیا گیا ہو۔ ایک شاعر نے فرمایا ہے ؎

میری فریاد سے ظاہر ہے بیان دہلی
دل خوں گشتہ پہ ہے داغ زبانِ دہلی

شاطر دہلوی کا شعر ہے ؎

غدر کو تیغ نہ سمجھوں تو بھلا کیا سمجھوں
دل پہ آتا ہے نظر زخم زبانِ دہلی

ظہیر دہلوی نے کس درد سے کہا ہے ؎

رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

زبان کے ساتھ اہل علم و اہل فن کا ماتم بھی کچھ کم نہیں کیا ہے ایک مرثیہ کا شعر ہے ؎

غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے
مذاق شعرِ سخن اُٹھ گیا زمانے سے

مولانا حالی نے بالکل سچ فرمایا ہے ؎

جتنے رہتے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز
کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدرشناس قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

"دنیا بامید قائم است،، فارسی کا ایک پُرانا مقولہ ہے فی الواقع اُمید ہی وہ چیز ہے جو ٹوٹے ہوئے دلوں کو ڈھارس بندھاتی ہے اُس کے خیال سے مردنی زندگی سے بدل جاتی ہے دلی کے ستم رسیدہ شعرا کو بھی مایوسی میں اُمید کی جھلک نظر آتی تھی اور ان کے دل سے یہ آوازیں نکلتی تھیں ؎

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دکھلادے
الٰہی پھر اسے حسب مراد دکھلادے

ایک فارسی نوحہ میں اس طرح دعا مانگی گئی ہے ؎

باز شش از لطف و کرم آباد کن
ساکنانش را خدایا شاد کن

حکیم آغا جان عیش کا دعائیہ شعر ہے ؎

الٰہی کر دے پھر آباد باغِ دہلی کو
کر اپنے فضل سے روشن چراغِ دہلی کو

سنہ ۱۹۱۱ء میں جبکہ ہنگامہ ۱۸۵۷ء کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا ان دعاؤں کی قبولیت کا وقت آیا اور انگریزی حکومت نے ہندوستان کے قدیم دارالسلطنت کو چھوڑ کر کلکتہ میں جو نیا گھر بسایا تھا جارج پنجم ملک معظم کی زبان کی ایک گردش نے اس کو اجاڑ کر دلی کو پھر بھاگ لگا دیئے. نئی حکومت نے نئی دہلی بسائی اور فلک نما عمارتیں لاکھوں روپیہ صرف کرکے تیار کر دیں جن کی افتتاحی رسم اسی ماہ فروری میں ادا ہوئی ہے ان عمارتوں میں نائب السلطنت گورنر جنرل ہند کے رہنے کا مکان بھی ہے. ہندوستان کی مرکزی مجلس وضع قوانین کا ایوان بھی ہے۔ نئی دہلی ہی میں ہندوستان کا نیا نظام حکومت جس کی بنیاد جمہوریت کے اصول پر رکھی جانے والی ہے رونما ہوگا اور نئی دہلی کی تعمیر ہندوستان کے لیے مبارک ثابت ہوگی اور نظام حکومت کا یہ نیا انقلاب اُن مصیبتوں کو جو پچھلے انقلابوں میں نازل ہو چکی ہیں بھلا دے گا

یہ ہے انقلاب دہلی کی مختصر داستان اور بس۔

خاکسار
نظامی عفی عنہ

نظامی پریس بدایوں
۱۴ فروری ۱۹۳۱ء



فہرست نظم ہائے مشمولہ انقلابِ دہلی

آزردہ مولوی مفتی صدرالدین خاں مرحوم دہلوی

۱۸۵۷ء سے پہلے صدر الصدور تھے۔ میر ممنون دہلوی سے تلمذ تھا۔ ۱۲۰۴ھ م ۱۷۸۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۶ر جولائی ۱۸۶۸ء م ۱۲۸۵ھ میں انتقال ہوا۔

آفت اس شہر میں "قلعہ کی بدولت آئی
واں کے اعمال سے دلّی کی بھی شامت آئی

روزِ موعود سے پہلے ہی قیامت آئی
کالے میرٹھ سے یہ کیا آئے کہ آفت آئی

گو شنیدہ تھا جو فسانوں سے وہ آنکھوں دیکھا
جو سُنا کرتے تھے کانوں سے وہ آنکھوں دیکھا

جن کو دنیا میں کسی سے بھی سروکار نہ تھا
اہل نااہل سے خلطا انھیں زنہار نہ تھا

اُن کی خلوۃ سے کوئی واقفِ اسرار نہ تھا
آدمی کیا ہی فرشتہ کا بھی واں بار نہ تھا

وہ گلی کوچوں میں پھرتے ہیں پریشاں در در
خاک بھی ملتی نہیں اُن کو کہ ڈالیں سر پر

زیور الماس کا سب جن سے نہ پہنا جاتا
بھاری جھومر بھی کبھی سر پہ نہ رکھا جاتا

گلوچ کا جن سے دوپٹہ نہ سنبھالا جاتا
لاکھ حکمت سے اُڑھاتے تو نہ اوڑھا جاتا

سر پہ وہ بوجھ لئے چار طرف پھرتے ہیں
دو قدم چلتے ہیں مشکل سے تو پھر گرتے ہیں

طبع جو گہنے سے پھولوں کے اذیت پاتی
صبح سے شام تلک نیند نہ اُن کو آتی
مہندی ہاتھوں میں لگا سوتے تو گھبراتی
ایک سلوٹ بھی بچھونے میں اگر پڑ جاتی
اُن کو تکیہ کے بھی قابل نہ خدا نے رکھا
سنگ پہلو سے اُٹھایا تو سرہانے رکھا

جن کو بن دوشِ پرستار نہ چلتے دیکھا
کبھو بیدار نہ سورج کے نکلتے دیکھا
صبح سے شام تلک عطر ہی ملتے دیکھا
پاؤں دابے پہ بھی کروٹ نہ بدلتے دیکھا
وہ ہیں اور دشت ہیں اور کوہ ہیں اور نالے ہیں
قدم اُٹھتا نہیں پاؤں میں پڑے چھالے ہیں

عیش و عشرت کے سوا جن کو نہ تھا کچھ بھی یاد
ٹکڑے ہوتا ہے جگر سُن کے یہ اُن کی فریاد
لُٹ گئے کچھ نہ رہا ہو گئے بالکل برباد
پھر بھی دیکھیں گے الٰہی کبھو دہلی آباد
کب تلک داغِ دل ایک ایک کو دکھلائیں ہم
کاش ہو جائے زمیں شق تو سما جائیں ہم

دیکھ سکتے نہ تھے جس بات پہ وہ اڑتے تھے
پاؤں رکھتے تھے کہیں اور کہیں پڑتے تھے
صلح سے زیادہ مزا تھا جو کبھو لڑتے تھے
آنچلوں سے نرے مقیش پڑے جھڑتے تھے
اُن کو رونے کے سوا شغل نہ کچھ رہتا ہے
ایک دریا ہے کہ آنکھوں سے پڑا بہتا ہے

عطر صندل میں جو دامن کو بسایا کرتے
بیٹھ خلوت میں جو زلفوں کو بنایا کرتے
گُنٹھے موتی کے گریباں میں لگایا کرتے
یہ سنگھار آئینے کو بھی نہ دکھایا کرتے
اب نہیں کچھ بھی اُنھیں زلفِ پریشاں کی خبر

نہ گریباں کی خبر اور نہ داماں کی خبر

روز بن ٹھن کے نکلنا وہ جوانوں کا کہاں ۔۔۔ بیٹھنا نازو ادا سے وہ دوگانوں کا کہاں
شور ہر کوچہ سے ٹپوں کی وہ تانوں کا کہاں ۔۔۔ لطفِ ساقی کا مزا اور وہ گانوں کا کہاں

وہ مغنی نہ رہا اور وہ ساقی نہ رہا
دھوتی بندوں کے سوا کوئی بھی باقی نہ رہا

شکل ایسی کہ خدا اُس کو نہ پھر دکھلاوے ۔۔۔ اُن کی پوشاک کو گر دیکھیں تو پھر ڈی آوے
نظر آجائیں اگر وہ سر راہے گاہے ۔۔۔ خون اپنا کریں یا اُن کا یہی جی چاہے

جن کے ہاتھوں سے نہ لیں بیڑہ بھی دو کوڑی کے
چاندنی چوک میں پھرتے ہیں وہ اپنے گیلے

روز وحشت مجھے صحرا کی طرف لاتی ہے ۔۔۔ سر ہے اور جوشِ جنوں سنگ ہے اور چھاتی ہے
ٹکڑے ہوتا ہے جگر جی ہی پہ بن جاتی ہے ۔۔۔ مصطفٰے خاں کی ملاقات جو یاد آتی ہے

کیونکہ آزردہ نکل جائے نہ سودائی ہو
قتل اس طرح سے بے جرم جو صہبائی ہو

احسن ۔ حکیم محمد احسن خاں مرحوم دہلوی

حکیم محمد محسن خاں مرحوم دہلوی کے صاحبزادے ۔ مرزا قربان علی بیگ سالک کے شاگردِ خاص تھے عنفوانِ شباب تھا کہ [illegible]ھ م [illegible]ء میں انتقال ہوا۔

ہائے وہ لوگ جو تھے روحِ روانِ دہلی ۔۔۔ آہ در خلد گئے کر کے گمانِ دہلی
تھر موسیٰ صعقا کی ہو تجلی پیدا ۔۔۔ بقعۂ نور ہے ہر ایک مکانِ دہلی

چاندنی چوک کو سینہ کہیں اور قلعہ کو سر
مسجدِ جامع کو ٹھہرائیں میانِ دہلی

لام دہلی علم اور ہائے کا شوشہ پر چشم
اَب تو باقی ہی فقط نام و نشانِ دہلی

کیا کوئی فتنہ ہی اے چرخِ ستمگر باقی
چشمِ خورشید سے کیوں ہی نگرانِ دہلی

غمِ بربادیِ دہلی میں بجائے مئے ناب
خونِ دل پیتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

یہ محبت ہی مجھے یہاں سے کہ بعد از مردن
روزنِ قبر سے بھی ہوں نگرانِ دہلی

کیا عجب ہی کہ یہی خلد میں بولی جاوے
اہلِ جنت کی پسند آئے زبانِ دہلی

سینہ احسن کا جو چیرا تو بقولِ رضواں
دلِ خوں گشتہ پہ ہی داغِ زبانِ دہلی

ایضاً

شہر خالی شدہ از پیر و جوانِ دہلی
رفت برباد متاعِ دل و جانِ دہلی

ایں طلسمے بود و غدر کشائندہ آں
کس ندانست چو من سرِّ نہانِ دہلی

دلِ حسرت زدۂ من شدہ گنجِ قاروں
درہم داغِ الم داد زبانِ دہلی

عینکِ مہر بچشمِ فلکِ پیر چرا ست
بخیالست مگر وا نشانِ دہلی

احسنِ خستہ جگر رفت بسوئے جنت
حوریاں را مگر آموخت زبانِ دہلی

احقر مولوی ممتاز حسین مرحوم بجنوری

جائے افسوس کہ آفت زدگانِ دہلی
جان دیتے ہیں جو کرتے ہیں بیانِ دہلی

خلد کے نام کو اب چاہیئے دہلی لکھیں
جا بسے جبکہ وہاں سارے سرانِ دہلی

کیا فصاحت کا کھول حال کسی سے نہ سنی
عرش سے فرش تلک مثل زبانِ دہلی

دین شایع تھا یہاں تک کہ صنم خانوں میں
درس توحید سناتے تھے بتانِ دہلی

ای فلک یہ بھی ہی انصاف کوئی نا انصاف
شہر ویرانہ ہو اب نام و نشانِ دہلی

قدسیوں کو نہیں آرام کہ تا روزِ جزا
عرش پر جائے گی ہر لحظہ فغانِ دہلی

فیضِ خواجہ سے وہی نزدِ خدا عزت ہی
گرچہ ظاہر میں گئی عزت و شانِ دہلی

آلِ فرعون کے جوں ظلم سے آلِ موسیٰ
ایسے بیکس ہوئے افسوس کسانِ دہلی

نہ رہا کوئی کیا ایسا فلک نے برباد
خضر و الیاس ہیں اب فاتحہ خوانِ دہلی

جس کو رضواں نے کئی بار خدا سے چاہا
تھا وہ دُنیا میں بلاریب مکانِ دہلی

یا خدا تو ہی ملک بھیج کہ آباد کریں
کوئی باقی نہیں اب مرتبہ دانِ دہلی

شکر ایزد کہ رہی مسجدِ جامع قایم
اب توقع ہو کہ یہ بچ گئی جانِ دہلی

کونسا غنچۂ دل تھا کہ نہ پژمردہ ہوا
ہند میں ایسی چلی بادِ خزانِ دہلی

یہ خداداد تھی وہاں عقل کہ ہنگامِ جزا
شیر پر ہوتے تھے سوار شہانِ دہلی

اب بھی ایسے ہیں کہ زک پائے فلاطوں ان سے
کوئی اڑ جائے اگر ہیچمدانِ دہلی

ہیچ تدبیر ہی تقدیر کے آگے ورنہ
کیسے کیسے تھے ذکی پیر و جوانِ دہلی

چل بسے ملکِ عدم کو کوئی باقی نہ رہا
وائے بر جورِ فلک فیض رسانِ دہلی

آج اس باغ میں ہر جا پہ ہیں اشجارِ زقوم
ظل افگن تھے جہاں سروِ چمانِ دہلی

جانِ احقر کی طرح بے سر و سامان رہی
لے گیا کون خدا تاب و توانِ دہلی

احمدؔ۔ میر شاہجہاں صاحب دہلوی

حیف برباد ہوئی شوکت و شانِ دہلی	ہاں مگر نام کو باقی ہے نشانِ دہلی
کیا ستم تجھ پہ پڑی سچ تو بتا پیرِ فلک	تونے چُن چُن کے بُلائے جو جوانِ دہلی
کیوں نہ پوچھیں کہ یہ آذر نے بنائے تو نہیں	دستِ قدرت نے تراشے ہیں بتانِ دہلی
کیوں چھپا پردۂ ظلمات میں آبِ حیواں	اُس نے دیکھا تھا مگر آبِ روانِ دہلی
ذکر وہ آکے سُنے خلد کا تم سے واعظ	جس نے دلی میں نہ دیکھے ہوں مکانِ دہلی
حشر میں حضرتِ باری کو بھی ہوگا افسوس	جبکہ بیٹھینگے وہاں مرثیہ خوانِ دہلی

اہل پورب کو غزل تم نہ سُنانا احمدؔ
سیکھ جائیں نہ کہیں طرزِ زبانِ دہلی

افسردہ۔ قاضی فضل حسین خاں مرحوم دہلوی

قاضی علی جان مرحوم رئیس دہلی کے صاحبزادے تھے۔ اس شہر آشوب کے سوا ان کے کلام کا پتہ نہیں چلتا۔ سنہ وفات معلوم نہوا۔ یہ سمجھنا چاہیئے کہ ۱۸۵۸ء یا اس کے قریب جب یہ نظم لکھی گئی زندہ تھے۔

ہر طرف سے ہے برستی بیکسی	رات دن کا ہو گیا رونا ہنسی
ہے ہجومِ درد و غم اور بے بسی	موت کو سمجھا ہوں اب مطلب رسی

اے کہ از وضع تو چرخ انگارہ
دردِ بے درمانِ ما را چارہ

ایک تو اندیشۂ روزِ جزا	اک غمِ بربادیِ عالم سرا

اور پھر رنج اپنے مال و جان کا | یارب اس طوفان سے تو ہی بچا

ہم توئی اینجا و آنجا دادرس
من ندارم در دو عالم جز تو کس

ہائے کیا دہلی پہ آفت آگئی | چین سے بیٹھے تھے شامت آگئی
سر پہ عالم کے مصیبت آگئی | فوج کیا آئی قیامت آگئی

وقتِ تنگ آمد ترحم یا رحیم
لطف کن بر دردمندانِ سقیم

تھی یہ دہلی رشکِ گلزارِ ارم | خاک سے تھا جس کی بنا جامِ جم
ہوگئی برباد و ویراں ہے ستم | ہے یہ وہ غم جس پہ خود رو دیوے غم

باز شش از لطف و کرم آباد کن
ساکنانش را خدایا شاد کن

آشنائے قلزمِ عیش و طرب | ہوگئے سب غرقِ دریائے تعب
جوششِ گریہ ہے جوشِ خندہ لب | چشم تر ہے جوں حبابِ بحر آب

از کجا ایں سیلِ آفت در رسید
کاینچنیں چشمِ فلک طوفاں ندید

بانٹتے تھے رات دن جو سیم و زر | پھینکتے تھے کوڑیوں کی جا گہر
مانگتے پھرتے ہیں اب وہ در بدر | رکھتے ہیں جائے درم داغِ جگر

الکرم العفو اے رب العلا
از طفیلِ حضرتِ خیر الوریٰ

جن کو گھر بیٹھے تماشے تھے ہزار — پھرتے ہیں وہ دربدر رسوا و خوار
عیش و عشرت تھا جنھیں لیل و نہار — یوں خزاں اب ہوگئی اُن کی بہار

عفو کن گر جرمے از کس سر زند
یا رب آں کن کاں بقوت مے سزد

داغِ غم سینے پہ کھائے بیٹھے ہیں — فکر میں سر کو جھکائے بیٹھے ہیں
تھا جو سرمایہ لٹائے بیٹھے ہیں — ہاتھ دُنیا سے اُٹھائے بیٹھے ہیں

رحم کن بر بیکساں ای دادرس
آہ از دل بر لب آید ہر نفس

کی خدا نے یہ دُعا بارے قبول — ہوگیا کافور ایک ایک بوالفضول
یعنی پھر حکامِ عادل کا نزول — ہوگیا تسکینِ دلہائے ملول

کرد ہر کس شکرِ رب العالمیں
شد رہا از بندِ غم جانِ حزیں

پھر گیا پھر آسمانِ پُر جفا — مخبروں نے کر دیئے فتنے بپا
بے گنہ اور باگنہ پکڑا گیا — جس کی جو قسمت میں لکھا تھا ہوا

نیست شکوہ از سپہرِ کینہ جو
انچہ در تقدیر بود آمد برو

اور ایسے فتنوں سے جو ڈرتے تھے — دمبدم توبہ کا وہ دم بھرتے تھے
پاس و حفظِ آبرو کو مرتے تھے — عمر کے دن اپنے پورے کرتے تھے

پادشاہا لطف کن بر ایں کساں

ہم بحفظ و ظلِ خود بخشی اماں

مدتوں کے بعد پھر فتنہ مٹا
اب اُسے حاکم سے ملتی ہی سزا

قید سے چھوٹے اسیرانِ بلا
جو ستاتا ہی کسی کو بے خطا

امن وہ ای داورِ روزِ جزا
پُر جفا را کن اسیرِ صد جفا

ابرِ حسرت دل پہ اپنے چھا گیا
ہائے قاضی اپنا پھانسی پا گیا

یہاں تو حسرت کو بھی رونا آگیا
عمر بھر افسردہ کو رُلو اگیا

اُنچہ بر من کرد چرخِ بدنہاد
ایچنیں اندوہ کافر را مباد

مجھسا دُنیا میں نہیں اندوہ گیں
جانِ سنگیں رکھتا ہوں دل آہنیں

شغل کوئی مجھ کو جُز ماتم نہیں
ورنہ مر جاتا تڑپ کر بالیقیں

یا الٰہی لطف کن بر حالِ ما
رحمتِ خود بیں مبیں اعمالِ ما

غیرتِ باغِ جناں یہ شہر تھا
انتقامِ عیش و عشرت ہو چکا

یک بیک برباد جو ایسا ہوا
اب یہ ہی ہر شخص کی ہر دم دُعا

لطف کن بر اہلِ دہلی ای خدا
تاکہ باشد آب و آتش را بقا

دل کو افسردہ کے خوش کر ای خدا
درپئے ایذا ہیں حاسد جا بجا

رات دن یہ رنج میں ہی مبتلا
دامِ مکر و کید سے اُن کے بچا

ہر بلائے صعب از وی دور دار
دشمنش را از غضب مقہور دار

اکرام حکیم محمد مرزا خاں مرحوم دہلوی

پوچھ مت حالِ زیانِ دہلی — ہائے ہیں اور بیانِ دہلی
اب تو نکلا تیرا ای چرخ غبار — مل گئی خاک میں شانِ دہلی
دولتِ حسن کو غم نے لوٹا — چھپ گئے سیمبرانِ دہلی
بن کھے چہرہ کہے دیتا ہی — بیکسی ہائے کسانِ دہلی
خاک میں مل گئے اہلِ ہنر — کھود کر دیکھ تو کانِ دہلی
یہ بھی ویسا ہی ہوا چاہتا ہی — جیسے پہلا ہی نشانِ دہلی[1]
ابتو جز حسرت و افسوس و الم — کوئی آتا نہیں میانِ دہلی
گریہ کی سیل ہی یہ نہر نہیں — روتے ہیں پیر و جوانِ دہلی
نہ وہ صورت ہی نہ وہ زینت ہی — غدر تھا آفتِ جانِ دہلی
نام سے اس کے ہی ایک جز و آباد — اب ہی ویران جہانِ دہلی
فرطِ بارش نے گرائے اکرام — کچھ جو باقی تھے مکانِ دہلی

تجمل حکیم تجمل حسین خاں مرحوم دہلوی

خلف ممتاز الدولہ نواب غلام رسول خاں۔ آغا جان عیش کے شاگرد تھے ۱۲۹۰ھ مطابق ۱۸۷۳ء میں پچاس سال کی عمر میں انتقال ہوا۔

[1] پرانی دہلی کی طرف اشارہ ہی۔

صرف اک نام کو باقی ہے نشانِ دہلی
نہ وہ رفعت ہے نہ شوکت ہے نہ نشانِ دہلی

ہفت اقلیم میں اس شہر کی تھی دھاک بڑی
کوئی دنیا میں نہ تھا شہر بشانِ دہلی

ہر گلی کوچہ تھا اس شہر کا صد رشکِ ارم
غیرتِ خلد تھا ہر ایک مکانِ دہلی

سڑکیں وہ پاک کہ ہوں عارضِ خوبانِ محبوب
صاف جوں آئینہ ہر ایک دکانِ دہلی

غیرتِ چشمۂ حیواں تھا ہر اک چشمۂ آب
رشکِ تسنیم تھی ہر نہرِ روانِ دہلی

گرچہ اب خاک سی اڑتی ہے ولے اس پہ بھی
روکشِ بادِ بہاری ہے خزانِ دہلی

چھین لیتے تھے بس اک نیم نگہہ میں دل کو
آفتِ جان تھے وہ آفتِ جانِ دہلی

وہ ہنرمند کہاں اور کہاں اہلِ کمال
اُن کے مٹنے سے مٹی شوکت و شانِ دہلی

کون ایسا ہے کہ جس پر نہیں صدمہ اس کا
جگرِ ماہ پہ ہے داغِ زیانِ دہلی

ہائے رے حسرتِ دیدار کہ خارج شدگاں
گھڑیاں سر پہ ہیں اور ہیں نگرانِ دہلی

وہ گل اندام جو پھولوں میں پڑے تلتے تھے
ہوئے پامالِ خزاں آہ بسانِ دہلی

نہ وہ گانا نہ بجانا نہ وہ میلے ٹھیلے
اہلِ عشرت ہیں سب مرثیہ خوانِ دہلی

سینہ کوبی ہے کبھی اور کبھی آہ و فغاں
لب پہ نالہ ہے کبھی گاہ بیانِ دہلی

احمدِ پاک کی خاطر تھی خدا کو منظور
ورنہ قرآن اُترتا بزبانِ دہلی

چاندنی چوک کا عالم نہ دریبے کا وہ حسن
خاص بازار کی زینت نہ وہ آنِ دہلی

کالے آئے تھے یہ کیا کالی بلا آئی تھی
ہو گئے خاک بسر خورد و کلانِ دہلی

ہائے رے حبِّ وطن صدمے اُٹھائے کیا کیا
اُس پہ بھی آن بسے لوگ میانِ دہلی

گھر چھٹا شہر چھٹا پر نہ چھٹے حضرتِ عشق
طرفہ معجون ہیں یہ پیر و جوانِ دہلی

شکر صد شکر کہ حکامِ عدالت گستر
باعثِ امن ہوئے آکے میانِ دہلی

پھر ہو منظور بدل زینت و رونق یہاں کی	۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ؎
شعر جانسوز یہ دو چار تجمل نے کہے	جی یہ چاہے ہو سنے جاؤں بیانِ دہلی

ایضاً

مل گئے خاک میں سب غنچہ لبانِ دہلی	آگ لگ جائے تجھے بادِ خزانِ دہلی
چشم نمناک دل افسردہ ہو صد پارہ جگر	بیٹھے اس طرح سے ہیں غمزدگانِ دہلی
اور مت آگ لگا شمعِ خیالِ جاناں	خود جلے بیٹھے ہیں دل سوختگانِ دہلی
دربدر خوار پھرے مال لٹا شہر چھٹا	پیٹیں کس کس کو بھلا ماتمیانِ دہلی
نہ محافل نہ مجالس نہ الگ گوشہ کوئی	بیٹھ کر روئیں کہاں نوحہ گرانِ دہلی
نہ وہ ناکو نہ پری چہرہ نہ مہ و لبِ بام	نہ وہ بازار نہ وہ سیر کنانِ دہلی
نہ طرحداروں کا بن ٹھن کے نکلنا سرِ شام	نہ وہ چشمک زنیٔ ماہ رخانِ دہلی
نہ وہ عشوہ نہ وہ شوخی نہ وہ غمزہ نہ ادا	کچھ نئی وضع سے ہیں خوش وضعانِ دہلی
مسجدِ جامع کی رونق نہ وہ گدڑی کی بہار	نہ وہ زہاد خدارس نہ بتانِ دہلی
سرنگوں ہوتے تھے یہاں دیکھ کے جن کو زاہد	اب خدا جانے کہاں ہیں وہ بتانِ دہلی
ہائے رے سوزِ محبت کہ پھکا جاتا ہوں	یاد جب آتے ہیں وہ شعلہ رخانِ دہلی
مال مستی سے جنھیں ہوش نہ تھا دنیا کا	فاقہ مستی میں وہ ہیں عشرتیانِ دہلی
چوکڑی بھولتے تھے دیکھ غزالانِ ختن	ایسے انداز کے تھے خوش نگہانِ دہلی
طعنہ زن ہو وے زلیخا پہ یہاں کے عشاق	فخرِ یوسف پہ کریں کج کلہانِ دہلی

مشغلہ اپنا تجمل کرے کیا خاک رقم
ہمنشیں اس کے ہیں کل ماتمیانِ دہلی

؎ ایک مصرعہ کتابت میں رہ گیا یعنی اصل میں نہیں ہے۔

ایضاً

پھر بندھا دل پہ خیالِ دہلی — پھر ہوا رنج و ملالِ دہلی
پھر نئے سر سے طپش ہے دل کو — سرد کچھ پاتا ہوں حالِ دہلی
مٹ گیا عیش و تنعم سب کا — لُٹ گیا مال و منالِ دہلی
ڈھونڈھتی پھرتی ہیں آنکھیں ہر جا — کیا ہوئے اہلِ کمالِ دہلی
تھی غضب اس کی ترقی ہے ہے — آفت جاں ہے زوالِ دہلی
جان دیتے تھے جہاں کے دلبر — تھا عجب حسن و جمالِ دہلی
حاتم طائی چھپا زیرِ زمیں — دیکھ کر دستِ نوالِ دہلی
جس کو دیکھا اُسے خواہاں اُس کا — سب کے لب پر ہے سوالِ دہلی
خلد اک باغِ خزاں دیدہ ہے — کون کہتا ہے مثالِ دہلی
نہیں بچنے کا پڑے گا بے شک — چرخ کی جاں پہ وبالِ دہلی
کانپا بس خوف سے مریخِ فلک — دیکھ کر جنگ و جدالِ دہلی
ابتدا جیسی ہوئی خوب ہوئی — دیکھئے کیا ہو مآلِ دہلی
بس تجمل کی دعا یہ ہے خدا — اب ترحم ہو بحالِ دہلی

ایضاً

پھرتے چلتے جو میں آنکلا بشہرِ دہلی — وہ مکاں مجھ کو نظر آئے نہ اُس جا وہ مکیں
نہ دُکانوں کی وہ رونق نہ وہ لطفِ بازار — نہ وہ خوبی سڑک اور نہ صفائی زمیں
نہ کٹوروں کی وہ جھنکار نہ شورِ خلقت — نہ پریزادوں کا وہ غول نہ حسن نمکیں
نہ وہ کوٹھوں کی سجاوٹ نہ وہ کمروں کی نمود — نہ کوئی ماہ لقا اور نہ کوئی زہرہ جبیں

سب طرف دیکھا نہ پایا کوئی واں راحتِ جاں — دلِ مضطر نے کسی جائے نہ پائی تسکیں
چرخِ بدکیش کو کیا کوسوں نہ چھوڑے اس نے — وہ نزاکت بھرے انسان وہ اہلِ تمکیں
ایسے ایسے تھے کہ اچھوں کو غش آجاتے تھے — کھول دیتے تھے جدھر اپنی وہ زلفِ مشکیں
خوں رلایا انھیں جلادِ فلک نے کیا کیا — وہم سے کرتے نہ جو ہاتھ حنا سے رنگیں
ملنا دشوار رہا اب اُن سے تو ای پیکِ خیال — دلِ بیتاب کو کس طرح سے آجائے یقیں
لگ گئی کس کی نظر کون تھا ایسا کمبخت — کور ہو جائے الٰہی کہیں چشمِ بدبیں
باغ کی سمت جو آیا تو میں کیا دیکھتا ہوں — خاک سی اُڑتی ہے گل بوٹے کا واں نام نہیں
جس طرف دیکھا تو ایک ڈھیر تھا خاروخس کا — نہ تو نرگس تھی نہ سوسن نہ سمن نے نسریں
سو سو اٹھکھیلی سی چلتی تھی جہاں بادِ نسیم — بادِ صرصر کا بھی دیکھا تو نہ تھا نام کہیں
عندلیبانِ چمن چہچہے کرتے تھے جہاں — ایک چڑیا بھی نہ دیکھی وہاں کرتی چیں چیں
تھی جہاں نغمہ سرائی طیورِ گلشن — مرثیہ خوانوں کی سی آئے ہے آواز حزیں
آشیانے ہیں وہاں زاغ و زغن کے صدہا — تھے جہاں سیکڑوں طاؤس ہزاروں شاہیں
چوب بوسیدہ کا انبار پڑا تھا کہ جہاں — سروِ نوخیز کھڑے رہتے بزیب و تزئیں
تودہ تودہ تھا پڑا ہائے وہاں بول و براز — جس جگہ رہتی تھی آراستہ بزمِ رنگیں
چہچہے قہقہے ہیں جن کی گزرتی اوقات — مثلِ ماتم زدہ بیٹھے نظر آئے غمگیں
دیکھ یہ حال بصد حسرت و صد یاس و الم — بس تجمل نے پڑھا مطلعِ ثاقب وہیں

ای کہن سال فلک دشمنِ جانِ دہلی
کیا ترے ہاتھ لگا کھو کے نشانِ دہلی

تشنہ۔ محمد علی مرحوم۔ دہلوی

خوش فکر مگر آزاد منش اور رند مشرب تھے۔ پہلے ذوقؔ مرحوم سے اور بعد کو عیشؔ مرحوم سے اصلاح لیتے تھے ۱۲۸۴ھ میں بمقام ریاست الور انتقال ہوا (بعض اوقات برہنہ بھی رہتے تھے)

عجیب کوچۂ رشکِ جناں تھا دہلی کا ۔ بہشت کہتے ہیں جس کو مکاں تھا دہلی کا
دماغ بر سرِ ہفت آسماں تھا دہلی کا ۔ خطاب خطۂ ہندوستان تھا دہلی کا

غضب ہے اُس کو کوئی شادماں نہ دیکھ سکا
زمیں نہ دیکھ سکی آسماں نہ دیکھ سکا

ہزاروں زلفِ پریوش کے یاں تھے سودائی ۔ ہزاروں میکش و میخوار مستِ صہبائی
شرابِ عیش پلاتا تھا چرخِ مینائی ۔ قبول کرتے تھے اس در کی سب جبیں سائی

جو آتا تھا سو وہ ہو رہتا تھا اِسی گھر کا
زمیں کی ناف ہے کعبہ ہے بطنِ مادر کا

یہاں کی خاک میں کیفیتِ ابرِ باراں کی ۔ یہاں کے آب میں تاثیر آبِ حیواں کی
یہاں کی بادِ بہاری ہوا زمستاں کی ۔ یہاں کی آگ میں گرمی تھی شعلہ ویاں کی

ہر ایک شخص کے حق میں یہ شہر اچھا تھا
مریضِ عشق کے بھی واسطے مسیحا تھا

وہ تختِ سلطنت و بارگاہ سلطانی ۔ کہ جس میں بیٹھتے تھے آکے ظلِ سبحانی
پروں سے سر پہ ہما کرتا تھا مگس رانی ۔ بجا اس اوج پہ تھا دعویِٔ سلیمانی

ہر ایک قصر کو دعویٰ تھا طاقِ کسریٰ کا
دماغ عرش پہ تھا قلعۂ معلّے کا

کسی زمانہ میں ایسا تھا یاں کا تخت نشیں
خراج دیتے تھے سب بادشاہِ روئے زمیں
خطا و ملکِ ختن سب تھے اس کے زیرِ نگیں
مدام کانپتے تھے اس سے چین اور ماچین

دیارِ ہند تھا مشہورِ خلق نام اس کا
چراغ روم سے جلتا تھا تا بہ شام اس کا

زحل کی آنکھ پڑی اتفاق سے ناگاہ
تمام ہو گیا تاراج ملک و مال اور جاہ
گدا سے ہو گئے بدتر غریب شاہنشاہ
رعیت ان کی ہوئی ان سے بھی زیادہ تباہ

وہ ساہوکار نہ تھا جس کی ساکھ میں بٹّا
اب اس کے نام پہ لگتا ہے لاکھ میں بٹّا

یہ لوگ کہنے لگے آگ اس وطن کو لگے
نظر نہ ایسی الٰہی کسی چمن کو لگے
سُنانے اہلِ سخن صاحبِ سخن کو لگے
جو ایک تار بھی باقی ہو تو کفن کو لگے

تمام شہر تلنگوں نے آ کے لوٹ لیا
مثل ہے بھوکوں کو ننگوں نے آ کے لوٹ لیا

ملا یہ حکم کہ سب لوگ یاں سے ٹل جائیں
اسی میں خیر ہے جو شہر سے نکل جائیں
دبے ہیں پیچھے تو دکھلا کے یہاں نکل جائیں
جو کچھ ہو چھوڑ یہاں صاحبِ دل جائیں

نہ سر پہ ٹوپی ہے اُن کے نہ پاؤں میں جوتی
بغل میں طوطی کا پنجرا نبی جی بھیجو جی

میانِ راہ کھڑے تھے وہ رہزنِ بے پیر
کہ جن کے ہاتھ میں لاٹھی تھی مثلِ گرزِ نکیر

یہ کہہ رہے تھے کہ آگے بڑھو صغیر و کبیر ۔۔۔ کہاں سے کھینچ کے لائی انھیں کہاں تقدیر

سب اُن کے خوف سے کرتے تھے آہ و نالے لوگ
مثال غول بیاباں تھے گاؤں والے لوگ

گرہ ٹٹولی کسی کی کمر پہ ڈالا ہاتھ ۔۔۔ ہر ایک مضطر و خستہ جگر پہ ڈالا ہاتھ
پدر کو چھوڑ دیا تو پسر پہ ڈالا ہاتھ ۔۔۔ جو سر برہنہ تھا اُس کے بھی سر پہ ڈالا ہاتھ

الٰہی ہاتھ نہ ٹوٹے ستم شعاروں کے
کہ ہاتھ دھو کے پڑے پیچھے خاکساروں کے

یہاں جو آن کے دیکھی تو دار کی صورت ۔۔۔ وہ دار کہیے جسے ذوالفقار کی صورت
مٹا دی چشم زدن میں ہزار کی صورت ۔۔۔ نظر پڑی نہ کسی بے قرار کی صورت

برنگ تیر شہاب آگ میں جلے لاکھوں
سپرد دار و رسن ہو گئے گلے لاکھوں

مکاں کو آکے جو دیکھا تو لامکاں ہے وہ ۔۔۔ جہاں نہ چند بھی بیٹھے اب آشیاں ہے وہ
جو شہر یار کو پوچھا کہو کہاں ہے وہ ۔۔۔ تو یہ سُنا کہ کھنڈر دیکھ لو نشاں ہے وہ

نہ اہل شہر رہے اور نہ شہر یار رہا
رہا تو نام ہی خالق کا برقرار رہا

رہی نہ جنس محبت کی اب خریداری ۔۔۔ جو یوسف آئیں تو ہو تو بھی گرم بازاری
اُٹھائے کون حسینوں کی ناز برداری ۔۔۔ لگائے دل کو کوئی جان کس کو ہے بھاری

بقول شخص عجب ملک حسن بستی ہے
کہ دل سی چیز یہاں کوڑیوں کو سستی ہے

کسی کا دل نہیں اس دور میں ٹھکانے سے	رہی نہ گانے سے شوق اور نہ بجانے سے
غرض نہ غیر سے مطلب نہ ہی یگانے سے	وفا و مہر تلک اُٹھ گئی زمانے سے

کہاں سے لائیں وہ پہلی سی اب وفا معشوق
اسی سبب سے ہیں مشہور بے وفا معشوق

کوئی کہے کہ تپ غم کی بس کہ شدّت ہے	تو یوں کہیں کہ ہمیں آپ ہی حرارت ہے
چڑھا ہوا ہے بخار آج کل یہ نوبت ہے	تم اپنا کام کرو۔ جاؤ تم کو رخصت ہے

مریض جا کے کرے کیا کہ طعن کرتے ہیں
طبیب اپنا مرض خود بیان کرتے ہیں

جو شعر کہتے ہیں اور لوگوں کو سناتے ہیں	وہ بیٹھے رہتے ہیں آتے ہیں اور رنجاتے ہیں
جو قدر دان نہیں اپنا کسی کو پاتے ہیں	تو دل ہی دل میں وہ خون جگر کو کھاتے ہیں

غزل کا ذکر نہ چرچا کسی یگانے سے
مذاقِ شعر و سخن اُٹھ گیا زمانے سے

ثاقب۔ نواب شہاب الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

خلفِ اکبر نواب ضیاء الدین احمد خاں والیِ لوہارو۔ وہ بھی اعظم دہلی شاگرد مرزا غالب ۶ محرم الحرام ۱۲۸۶؁ھ مطابق ۹ اپریل ۱۸۶۹؁ء بعمر ۲۹ سال انتقال ہوا۔

ہائے کہن سال فلک دشمنِ جانِ دہلی	کیا ترے ہاتھ لگا کھو کے نشانِ دہلی
حیف صد حیف کھدی شاہجہانی تعمیر	وائے صد وائے مٹی شوکت و شانِ دہلی
وہاں قلعہ ہے نہ دریبہ نہ سڑک پھر کیونکر	دلی والوں کو ہو جنت پہ گمانِ دہلی
اس کی ویرانی سے آباد ہوئے اور بلاد	ہے بہارِ چمنِ دہر خزانِ دہلی
اہلِ دہلی نہ کریں بخت کا شکوہ کیونکر	بخت خاں جی ہوئے جب باج ستانِ دہلی

سحر آہنگ مغنی تھے ہزاروں او راب — کچھ جو باقی ہیں سو ہیں مرثیہ خوانِ دہلی
حاکمِ عادل و دانا کو خدا نے بھیجا — تب یہ آباد ہوئے چند مکانِ دہلی
کون وہ داورِ جم مرتبہ کوپر صاحب — کہ جسے خلق کہے شاہجہانِ دہلی
شہر والوں کو یہی وردِ زباں ہے شب و روز — کہ سلامت رہے یہ فیض رسانِ دہلی
پھر وہی مسجدِ جامع کے ہے بازار کی دھوم — پھر ہے آراستہ ہر ایک مکانِ دہلی
پاس مسجد کے شفاخانہ ہے ایسا کہ جسے — ہے بجا کہیے اگر روحِ روانِ دہلی
قلعہ میں ہے وہ پریزاد عجائب خانہ — کہ صنم خانۂ چیں ہے نگرانِ دہلی
چاندنی چوک بگڑ کر وہ بنا از سرِ نو — کہ کہیں گے ہم اسے بختِ جوانِ دہلی
چوک کے باغ میں وہ رنگ ہے آرائش کا — کہ قسم کھائے ہے فردوس بجانِ دہلی

اہلِ ایراں یہ غزل سن کے کہیں گے بیشک
بود ثاقب مگر از اہلِ زبانِ دہلی

حسامی۔ مرزا حسام الدین حیدر مرحوم دہلوی

ان کے والد کا نام مرزا خانی تھا۔ فکرِ معاش سے تعلیم کی مہلت نہ ملی۔ موزونیِ طبع سے شعر کہہ لیتے تھے۔ موسیقی میں بھی دخل تھا اور اپنا کلام خود گاتے تھے۔ داستان گوئی اور جلاکاری ذریعہ معاش تھا۔ ۱۸۸۲ء مطابق سنہ ۱۳۰۰ھ میں زندہ تھے۔

گئی یک بیک جو ہوا پلٹ نہیں دل کو میرے قرار ہے — کروں غم ستم کا میں کیا بیاں مرا غم سے سینہ فگار ہے
وہ شہرِ دہلی یہ تھا چمن کہ تھا سب طرح کا یہاں امن — وہ خطاب اس کا تو مٹ گیا فقط اب تو اجڑا دیار ہے
یہ رعایا ہند تباہ ہوئی کہو کیا کیا ان پہ جفا ہوئی — جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ تو قابلِ دار ہے

شب و روز پھولوں میں جو تُلیں نکیوں خارِ غم سے وہ چھپ گھلیں … ملے طوق قید میں جب اُنھیں کہا بے گلے کے یہ ہار ہے

جو سلوک کرتے تھے اوروں سے اب ہیں دیکھو کس بُرے طور سے … وہ ہیں تنگ چرخ کے جور سے رہا تن پہ اُن کے نہ تار ہے

یہ جو بوئے تھے پیڑ ببول کے ہیں اُنھیں میں آج پھل لگے … جیسے جیسے ہم نے گناہ کیے یہ اُنھیں گناہوں کا بار ہے

پڑی آگ کے جانوں پہ ایسی بن کے نشے ہوئے سبھوں کے ہرن … جسے دیکھتا ہوں پڑا ہوا ہے گلے میں اشکوں کا ہار ہے

یہ وبال تن پہ ہی سر مرا انھیں جان جانے کا ڈر ذرا … بچے غم سے نکلے جو دم مرا مجھے اب زندگی بار ہے

یہاں حال تنگ جو سب کا ہے یہ کرشمہ قدرتِ رب کا ہے … یہاں بہار ہیں تو خزاں ہوئی وہاں خزاں اُنھوں کو بہار ہے

یہ ستم کسی نے بھی ہے سنا کہ دی پھانسی لاکھوں کو بے گنہ … وہ کلمہ گویوں کی طرف سے ابھی اُن کے دل میں غبار ہے

نہ تو دشمنائی ہے غیر میں نہ ہے اپنا یار کوئی ہے محب … چلا تیر اجل کا بھی شہر میں کیا لاکھوں کا جس نے شکار ہے

دیا جس نے غم ہے یہ برملا تو خوشی بھی دیگا وہی خدا … بھلا کون یہ نہیں جانتا کہ خزاں کے پیچھے بہار ہے

یہ زمانہ وہ ہے برا فلک چلو بچ کے سب سے الگ الگ … نہ رفیق کوئی کسی کا یاں نہ کسی کا کوئی بھی یار ہے

کیا حسامی ڈر تجھے حشر کا جو خدا رکھے تجھے برملا
تجھے ہے وسیلہ رسول کا کہ وہ تیرا حامیِ کار ہے

حالی۔ مولنٰنا الطاف حسین مرحوم پانی پتی

والد کا نام خواجہ ایزد بخش انصاری تھا ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے پہلے شیفتہ مرحوم کے اور بعد کو مرزا غالب مرحوم کے شاگرد ہوئے۔ ۴۰۔۴۵ سال کی مشق سخن کے بعد شاعری کی روش بدل کر "مدوجزر اسلام" مشہور اور مقبول مسدس لکھا۔ ۳۰ر دسمبر ۱۹۱۴ء م ۱۳۳۲ھ انتقال کیا۔ یہ غزل شرکت مشاعرہ کی آخری یادگار ہے۔ اس کے بعد مشاعرے میں غزل نہیں پڑھی یہ غزل دلّی پیاری کا مرثیہ اور بس

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز … دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز

عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظربازوں کی — دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز

زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی — زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز

چاہت اک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں — کسی دلالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز

ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے — تو جوانی میں نہ یہ روگ بسانا ہرگز

جتنے رمنے تھے ترے ہوگئے ویراں ای عشق — آکے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلی سے ترے قدر شناس — قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا ای دوست نہ چھیڑ — نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا ای بلبل — ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈھتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب — دردانگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصور ہمیں یاد آئیں گی — کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا ای چشم — دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لیکے داغ آئے گا سینے پہ بہت ای سیاح — دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک — دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانہ ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو — ای فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے — ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں — نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا ای چرخ — ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا ان پہ جہاں روتا ہے — ان کی ہنسی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجھ کو قسم ہے ساقی — بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یہاں سے رخصت ہوئے ہیں کبھی اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یہاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مرچکی اب زندہ نہ ہوگی یارو
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالبؔ و شیفتہؔ و نیرؔ و آزردہؔ و ذوقؔ
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومنؔ و علویؔ و صہبائیؔ و ممنونؔ کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز

کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز

داغؔ و مجروحؔ کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانہ ہرگز

رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھوگے کبھی لطفِ شبانہ ہرگز

بزمِ ماتم تو نہیں بزمِ سخن ہے حالیؔ
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

داغ - نواب مرزا خاں مرحوم - دہلوی

سلطان الشعراء بلبلِ ہندوستان۔ جہاں استاد۔ ناظم یار جنگ۔ دبیر الدولہ فصیح الملک بہادر ۱۲ ذی الحجہ ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء دہلی محلہ بلی ماراں میں پیدا ہوئے ۱۱-۱۲ برس کی عمر میں سب سے پہلی غزل نواب شیفتہ مرحوم کے مشاعرے میں پڑھی۔ قلعہ چھوڑنے کے بعد ۲۴ سال ریاست رامپور میں رہے اور نواب رامپور کے ساتھ حرمین شریفین کی زیارت سے مشرف ہوئے ۱۳۰۵ھ م ۱۸۸۸ء میں حیدرآباد پہنچے ۶ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ م ۱۸۹۴ء سے بحیثیت استاد نظام ایک ہزار روپیہ وظیفہ مقرر ہو گیا اور دورانِ امیدواری کی تنخواہ بھی اسی حساب سے ملی۔ ۱۸ سال تک حیدرآباد رہ کر ۹ ذی الحجہ ۱۳۲۲ھ م ۱۹۰۵ء

مطابق ۱۰ ؍ فروری ۱۹۰۵ء کو آٹھ روز مرض فالج میں مبتلا رہ کر حیدر آباد میں انتقال ہوا۔ وہیں یوسف شریف صاحب کی درگاہ میں دفن کیے گئے۔

فلک زمین و ملائک جناب تھی دلی | بہشت و خلد میں بھی انتخاب تھی دلی
جواب کاہے کو تھا لاجواب تھی دلی | مگر خیال سے دیکھا تو خواب تھی دلی

پڑی ہیں آنکھیں وہاں جو جگہ تھی نرگس کی
خبر نہیں کہ اسے کھا گئی نظر کس کی

یہ شہر وہ ہے کہ ہر انس و جان کا دل تھا | یہ شہر وہ ہے کہ ہر قدردان کا دل تھا
یہ شہر وہ ہے کہ ہندوستان کا دل تھا | یہ شہر وہ ہے کہ سارے جہان کا دل تھا

مٹی نہ آدمی یہاں سنگ و خشت کی صورت
بنی ہوئی تھی جو ساری بہشت کی صورت

یہاں کی شام تھی مانند صبح نورانی | یہاں کے ذرہ میں تھی مہر کی درخشانی
یہاں کے سنگ سے تیرہ تھا لعل رمانی | یہاں کی خاک سے ہوتا تھا آئینہ پانی

یہ شہر وہ ہے کہ سایہ بھی نور تھا اس کا
چراغ رشک تجلی ظہور تھا اس کا

فلک تھا خوبی حسن و جمال کا دشمن | صباح عشرت و شام وصال کا دشمن
عدوئے اہل کمال اور کمال کا دشمن | غرضکہ اب تو ہوا جان و مال کا دشمن

یہ مفت بر جو تلاشی ہیں نقد جاں کے لیے
خضر بھی رو دیں گے اب عمر جاوداں کے لیے

خدا پرستی کے بدلے جفا پرستی ہے | جو مال مست تھے اب ان کو فاقہ مستی ہے

بجائے ابرِ کرم مفلسی پرستی ہے — بتنگ جینے سے ہیں ایسی تنگدستی ہے

غضب میں آئی رعیت بلا میں شہر آیا
یہ پوربی نہیں آئے خدا کا قہر آیا

زباں سے کہتے ہوئے دین دین آئے لعیں — جو ماتا دین تھا کوئی تو کوئی گنگا دیں
یہ جانتے ہی نہ تھے چیز کیا ہے دینِ متیں — کیئے ہیں قتل زن و بچہ کیسے کیسے حسیں

روا نہ تھا کسی مذہب میں جو وہ کام کیا
غرض وہ کام کیا کام ہی تمام کیا

فلک نے قہر و غضب تاک تاک کر ڈالا — تمام پردۂ ناموس چاک کر ڈالا
یکایک ایک جہاں کو ہلاک کر ڈالا — غرضکہ لاکھ کا گھر اس نے خاک کر ڈالا

جلیں ہیں دھوپ میں شکلیں جو ماہتاب کی تھیں
کھچیں ہیں کانوں پہ جو پتیاں گلاب کی تھیں

عجیب شکل گل و گلستاں نظر آئی — پڑیں جدھر کو نگاہیں خزاں نظر آئی
جب اُٹھ کے تا مژۂ خونچکاں نظر آئی — تو کوئی عیش کی صورت نہ یاں نظر آئی

وہ گلرخانِ سمن بر کے قہقہے نہ رہے
وہ بلبلانِ خوش الحاں کے چہچہے نہ رہے

کھلایا زہر ستمگر نے پان کے بدلے — پلایا خونِ جگر پیچوان کے بدلے
نصیب دار ہوئی ہے نشان کے بدلے — ملا نہ گور گڑھا بھی مکان کے بدلے

عداوتِ فلکِ کینہ ساز تو دیکھو
اور اس پہ اس ستم آرا کے ناز تو دیکھو

لہو کے چشمے ہیں چشمِ پُرآب کی صورت
لٹے ہیں گھر دلِ خانہ خراب کی صورت

شکستہ کاسۂ سر ہیں حباب کی صورت
کہاں یہ حشر میں تو یہ عذاب کی صورت

زبانِ تیغ سے پرسش ہی دادخواہوں کی
رسن ہی طوق ہی گردن ہی بےگناہوں کی

زمیں کے حال پہ اب آسمان روتا ہی
نہ طفل و عورت و پیر و جوان روتا ہی

ہر اک فراقِ مکیں میں مکان روتا ہی
غرض یہاں کے لیے ایک جہان روتا ہی

جو کہیے جوششِ طوفاں تھمیں کہی جاتی
یہاں تو نوح کی کشتی بھی ڈوب ہی جاتی

بہ رنگِ بوے گل اہلِ چمن چمن سے چلے
نہ پوچھو زندوں کو بیچارے کس چلن سے چلے

غریب چھوٹ کے اپنا وطن وطن سے چلے
قیامت آئی کہ مُردے نکل کفن سے چلے

مقامِ امن جو ڈھونڈا تو راہ بھی نہ ملی
یہ قہر تھا کہ خدا کی پناہ بھی نہ ملی

یہ خاصیت تو نہ رکھتی تھی زہر کی گرمی
نہ دیکھیں جو نگہِ چشم و قہر کی گرمی

یہاں تھی شعلہ عذارانِ شہر کی گرمی
اُٹھائیں ہائے وہ جلتی دوپہر کی گرمی

تپش سے ایک بیابانِ آفتاب ہوئی
زمین مگر کرۂ نار کا جواب ہوئی

جگہ جگہ تھے زمیندار دار کی صورت
بلا سے کم نہ تھی ہر ایک گنوار کی صورت

چڑھے ہی آتے تھے سر پر بخار کی صورت
چھپی نہ اُن سے پرِ اہلِ دیار کی صورت

کسی جگہ جو کوئی ہو کے بے قرار آیا

تو اہلِ قریہ یہ بولے کہ لو شکار آیا

زبان بدلیں تو صورت بدل نہیں آتی
کسی طرح کسی پہلو سے کل نہیں آتی
ملیں جو خاک بھی منہ پر تو مل نہیں آتی
پکارتے ہیں اجل کو اجل نہیں آتی

جو سر کو پھوڑیں تو پتھر پرے سرکتے ہیں
جو لوٹیں کانٹوں پہ کانٹے الگ کھسکتے ہیں

بنا ہے خالِ سیہ رنگ مہ جمالوں کا
جو زور آہوں کا لب پر تو شور نالوں کا
دوتا ہوا ہے قدِ راست نونہالوں کا
عجیب حال دگرگوں ہے دلی والوں کا

کوئی مراد جو چاہی حصول بھی نہ ہوئی
دعائے مرگ جو مانگی قبول بھی نہ ہوئی

پیادہ پا ہوئے واں شہسوار صد افسوس
ذلیل و خوار ہوئے اہلِ وقار صد افسوس
لہو کے گھونٹ پئیں بادہ خوار صد افسوس
ہزار حیف دلِ بے قرار صد افسوس

جھکے ہیں بارِ الم سے تنے ہوئے کیسے
بگڑ گئے ہیں یکایک بنے ہوئے کیسے

پے محاسبہ پرسش ہے نکتہ دانوں کی
جو نوکری ہے تو اب یہ ہے نوجوانوں کی
تلاش بہرِ سیاست ہے خوش بیانوں کی
کہ حکمِ عام ہے بھرتی ہے قید خانوں کی

یہ اہلِ سیف و قلم کا ہو جبکہ حال تباہ
کمال کیوں نہ پھرے در بدر کمال تباہ

غضب ہے بخت بد ایسے ہمارے ہو جائیں
جو دانے چاہیں تو خرمن شرارے ہو جائیں
کہیں جو لعل و گہر سنگ پارے ہو جائیں
جو پانی مانگیں تو دریا کنارے ہو جائیں

پئیں جو آبِ بقا بھی تو زہر ہو جائے
جو چاہیں رحمتِ باری تو قہر ہو جائے

جہاز ایسا تباہی میں آگیا اپنا
ملا نہ تختہ ترا تک کہیں پتا اپنا
رہا نہ آہ زمانے میں آشنا اپنا
بجز خدا کے نہیں کوئی ناخدا اپنا

کسی سے ڈوبے ہوئے ایسے کب نکلتے ہیں
یہاں سے حضرتِ الیاس بچکے چلتے ہیں

یہ وہ جگہ ہی کہ عبرت پہ عبرت آتی ہی
یہ وہ جگہ ہی کہ شامت پہ شامت آتی ہی
یہ وہ جگہ ہی کہ آفت پہ آفت آتی ہی
یہ وہ جگہ ہی کہ حسرت پہ حسرت آتی ہی

یہ وہ جگہ ہی جہاں بکسی بھی ڈر جائے
یہ وہ جگہ ہی اجل خوف کھا کے مر جائے

کہاں تک اے کہوں اس کا حال بربادی
لکھوں کہاں تک اس آسماں کی جلادی
کسی کو قیدِ محن سے نہیں ہی آزادی
کہ داغ داغ ہی ہر دل ہر ایک فریادی

الٰہی پھر اسے آباد و شاد دکھلا دے
الٰہی پھر اسے حسبِ مراد دکھلا دے

ایضاً

یوں مٹا جیسے کہ دہلی سے گمانِ دہلی
تھا مرا نام و نشاں نام و نشانِ دہلی
لے گئے لوٹ کے اب شوکت و شانِ دہلی
پوربئے پہلے اڑاتے تھے زبانِ دہلی
دلی والوں کے لیئے تازہ بنے گی جنت
لے گئے سر پہ ملک تختہ مکانِ دہلی

گرم ہنگامہ ہوئے لالہ رخانِ پنجاب	گل کھلائے ہیں نئے تو نے خزانِ دہلی
رشکِ شمشاد تھا ہر خوش قد و ہر خوش رفتار	سروِ آزاد تھا ایک ایک جوانِ دہلی
عارضِ صاف تھا ایک ایک مصفا بازار	چشم پر جلوہ تھی ایک ایک دکانِ دہلی
اس سے بڑھ کر کوئی محشر میں نہیں طولِ حساب	بس یہی ہوگا کہ ہم اور بیانِ دہلی
دیدیا فوج کو حکام نے انعام میں سب	گنج قاروں سے فزوں گنجِ نہانِ دہلی
قلعہ کی بیچ کا میدان پھر اس میں وہ سڑک	کہ بدل کہئے جسے ہر دل و جانِ دہلی
گر یہ میدان نہ ہوتا تو ٹھکانا ہی نہ تھا	تنگ ہی رہتی سدا روحِ روانِ دہلی
رو کش سدِ سکندر اسے کہئے تو بجا	فتح گڈھ ہی جو پہاڑی پہ قرانِ دہلی
یا خدا مسجد جامع کا رہے نام بلند	کعبہ والے کہیں وہ آئی اذانِ دہلی
نیر و غالب و آزردہ سے پھر لوگ کہاں	داغ اب یہ ہیں غنیمت ہمہ دانِ دہلی

راقم۔ مرزا حسین علی خاں مرحوم۔ دہلوی

عارف مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے تھے۔ شدتِ رنج یا کثرتِ غم سے ایک ہی مطلع کہا مگر بہت ہی جل کر کہا۔ ۱۸۵۷ء میں جب یہ مطلع لکھا زندہ تھے۔

مٹ گیا خوب ہوا نام و نشانِ دہلی	کس کی یا پوتی بنے مرثیہ خوانِ دہلی

رضوان۔ شمشاد علی بیگ خاں مرحوم دہلوی

سالک دہلوی کے بڑے بھائی اور مرزا غالب کے شاگرد تھے بلند پرواز شاعر تھے۔

۱۲۹۳ھ ۱۸۷۶ء میں بعمر ۴۰ سال انتقال کیا۔

میری فریاد سے ظاہر ہے بیانِ دہلی ۔۔۔ دل خوں گشتہ پہ ہے داغ زبانِ دہلی

ہم کو معلوم تصور سے ہوا ہے اتنا ۔۔۔ عرش سے بڑھ کے ہے کچھ رفعتِ شانِ دہلی

کحلِ مازاغ لگاؤ تو کھلے راز کہ ہے ۔۔۔ چیدۂ عالمِ ارواح جہانِ دہلی

شہرِ دہلی کو اگر ہند کا دل کیجیے فرض ۔۔۔ حضرتِ قلعہ کو ٹھیرائیے جانِ دہلی

ہم نے پائے نہ ہنرمند کہیں دلی سے ۔۔۔ ہم نے دیکھا نہ کوئی شہر بسانِ دہلی

چھوڑ دے زہد کو زنّار رہن لے زاہد ۔۔۔ اک نظر دیکھے جو اندازِ بتانِ دہلی

حسنِ یوسف جو نہ دیکھا ہو کسی نے دیکھے ۔۔۔ ہر دکاں دار کے ہے پاس میانِ دہلی

ہم کو رونا تو یہی ہے کہ ہوئے ہم برباد ۔۔۔ اور اغیار ہوئے عشرتیانِ دہلی

گر نہ ہوں ہم ہو بازار میں گرمی کیونکر ۔۔۔ ہم ہی تھے جنس گراں بارِ دکانِ دہلی

دستِ یغمائے فلک سے نہ رہا کچھ باقی ۔۔۔ ہاں مگر واسطے نالے کے زبانِ دہلی

ہے عدم کی تجھے منظور خدایا رونق ۔۔۔ کہ اٹھایا انھیں جو لوگ تھے جانِ دہلی

کیا ہیں درکار مکاناتِ ارم میں یا رب ۔۔۔ کہ اٹھے جاتے ہیں دلی سے مکانِ دہلی

انتہا گم شدگی کی ہے عدم ہو جانا ۔۔۔ ہم نے پایا نہ عدم میں بھی نشانِ دہلی

کیا بتاؤں کہ ہوں کس صدمہ سے رضواں خاموش
دل خوں گشتہ پہ ہے داغ زبانِ دہلی

سالکؔ، مرزا قربان علی بیگ خاں مرحوم دہلوی

حیدر آباد میں پیدا ہوئے۔ دہلی میں تربیت پائی۔ ابتدا میں مومن کے اور بعد کو غالب کے شاگرد ہوئے۔ آخر میں بزمانۂ قیام حیدر آباد ۱۲۹۶ھ م ۱۸۷۹ء میں وہیں انتقال ہوا۔

جہاں میں شہر ہیں جتنے جہاں جہاں آباد
اُجڑ کے یاں سے نہ پوچھو ہوا کہاں آباد
بس اُن بلاد میں تھا منتخب جہان آباد
گیا عدم کو دوبارہ ہوا وہاں آباد
فلک نے کس سے کہوں کیوں اُٹھا لیا اُس کو
ارم کا قصر سمجھ کر اُٹھا لیا اُس کو

زبسکہ رکھتے ہیں دل سے عزیز سب اُس کو
سنا ہے بستے ہوئے آسماں پہ جب اُس کو
زمیں پہ ڈھونڈتے پھرتے ہیں روز و شب اُس کو
بلند شہر کہیں کیوں نہ لوگ اب اُس کو
یہ اُٹھ گیا ہے اور اُٹھنا نشانِ رفعت ہے
بلند شہر کو کیا ورنہ اس سے نسبت ہے

زمین پست یہاں کی تھی آسماں منظر
یہاں کی خاک تھی اکسیر سے بھی کچھ بہتر
ہر ایک ذرہ یہاں کا تھا مہر کا ہمسر
یہاں کی آب میں آبِ حیات کا تھا اثر
نسیم خلد سے بہتر سموم تھی یاں کی
یہ وہ چمن ہے کہ دُنیا میں دھوم تھی یاں کی

ہر اک مکان یہاں کا تھا ایک مکانِ سرور
ہر اک دُکان یہاں کی تھی اک دُکانِ سرور
ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک جہانِ سرور
غرضکہ شہر نہ تھا تھا یہ ایک کانِ سرور
جدھر کو دیکھیے آوازِ بربط و نَے ہے
نہ جانتا تھا کوئی رنج و غم کو کیا شے ہے

یہ شہر کس لیے برباد ہو گیا یارب
یہاں کے لوگوں سے کیا ہو گئی خطا یارب
لگی کسی کی ہے کیا ایسی بد دعا یارب
ہوئے ہیں کس [illegible] یارب
[illegible]

وگرنہ ہوتے نہ ہرگز سزائے دار ثقات

چلی تھی دہر میں گویا ہوا یہ چوپائی
تمام شہر کی خوب آگے خاک اُڑوائی
کہ فوج باغیہ چاروں طرف سے یاں آئی
یہ بادِ تند تھی خاشاک کی تمنائی

رہی نہ خاک بھی امن و امان کی صورت
کچھ اور ہو گئی سارے جہان کی صورت

یہ انقلاب ہے یا ہے قیامتِ صغرا
ہوئی ہے آدمی کی شکل شہر میں عنقا
کوئی نہیں ہے کہ جس کے رہے ہوں ہوش بجا
بنا ہے ہو کا مکاں بس ہر اک گلی کوچہ

ہوئے ہیں لوگ یہاں کے کہاں کہاں آباد
ہر ایک گاؤں بنا ہے مگر جہاں آباد

کسی کے لب پہ ہے نالہ کسی کی چشم ہے تر
کسی کا ہاتھ ہے دل پہ کوئی ہے تھامے جگر
کسی کا چاک گریباں ہے اور کوئی مضطر
غرضکہ رنج سے خالی نہیں ہے کوئی بشر

بجائے زمزمہ ہر جائے شیونِ غم ہے
محلِ عیش تھا یا اب سرائے ماتم ہے

مکاں شکستہ ہیں مانندِ خاطرِ مایوس
وہ شکل ہی نہ رہی شہر ہو گیا معکوس
اُجاڑ کوچے بسانِ دلِ الم مانوس
ستم کیا فلکِ بدشعار نے افسوس

یہ وہ جگہ ہے جسے دیکھنے کو خلقت آئے
اور اب جو دور سے دیکھے کوئی تو عبرت آئے

سمجھ کے اپنا ٹھکانا گئے جہاں ہم لوگ
بنے ہیں طائرِ گم گشتہ آشیاں ہم لوگ
ذلیل یاں سے زیادہ ہوئے وہاں ہم لوگ
پھرے ہیں امن کے طالب کہاں کہاں ہم لوگ

زمین ہو گئی دشمن نہ پائی جائے ثبات
ٹھہر سکا نہ کسی جا سے اپنا پائے ثبات

وہ لوگ کھاتے تھے جن کے نشاط کی قسمیں
محل میں رہتے تھے یاب ہوئے ہیں محبس میں
ہوئے ہیں طالعِ ناسازگار کے بس میں
نہ تاب دل میں ہے طاقتِ جانِ بیکس میں

جو تشنہ لب ہوں تو آبِ دمِ سناں موجود
جو گرسنہ ہوں تو کھانے کو گولیاں موجود

ہوئے ہیں قتل جو بیجرم لوگ دلی کے
کیا جنابِ الٰہی میں عرض رضواں نے
بہشت چاہیئے پہلے اُنھیں قیامت سے
کہ آج کل درِ فردوس کس طرح سے کھلے

ملا جواب کہ دلی کو لاؤ اُٹھوا کر
اور اُس گروہ کو اُس میں بساؤ لے جا کر

وہ جن کی طبع کہ آسودگی پہ مائل ہے
اُٹھائیں ایک قدم بھی اگر تو مشکل ہے
پیادہ کیونکہ چلیں ناقہ ہے نہ محمل ہے
قدم کہے کہ ٹھہر جاؤ یہ ہی منزل ہے

سروں پہ بوجھ ہے گٹھری کا لڑکھڑاتے ہیں
بس اپنے جی کی طرح بیٹھ بیٹھ جاتے ہیں

لکھوں میں پردہ نشینوں کا حال کیا یہ ہے
نہ آئی جن کی کبھی در تلک صدا ہی ہے
بیان مجھ سے ہو کیونکہ یہ ماجرا ہی ہے
نکل کے گھر سے چلیں وہ پیادہ پا ہی ہے

کبھی نہ غصہ میں بھی جا سکے جو باہر ہوں
غضب ہے یہ کہ وہ بے پردہ اور چادر ہوں

ہجومِ مسجدِ جامع کا کیا کروں اظہار
صفِ ملائکہ ہوتی جہاں نماز گزار

ہر ایک صف میں نہ رہتا مصلّیوں کا شمار | اب اس کو دور سے بھی دیکھنا ہوا دُشوار

نماز ہی نہ اذاں ہی نہ کوئی جاتا ہی
جب اُس کو دیکھیے خالی تو جی بھر آتا ہی

وہ اُس کے گرد کے بازار اور وہ زینت | ہجومِ خلق سے ہر روز ایک نئی صورت
کہ جس کے دیکھنے سے طبع کو ہو اک فرحت | یہاں سے جائیے کبھی میلہ میں تو ہو نفرت

الٰہی کیا ہوئے اجناسِ رنگ رنگ کے ڈھیر
پڑے ہوئے ہیں گل و خشت چوب و سنگ کے ڈھیر

درازدستیِ دیہاتیانِ بدانجام | خدا دکھائے نہ صورت کبھی سنائے نہ نام
کسی طرح سے سمجھ میں نہ آئے جن کا کلام | گریز پا جو نکل کر گئے لٹے وہ تمام

لٹا لباس تلک آبرو بھی ہاں کھوئی
گرہ میں کچھ بھی نہ نکلا تو نقد جاں کھوئی

بچاؤ جان کے اس جان کی محبت میں | گیا جو مضطربانہ کسی ریاست میں
تو گیر و دار سے آیا وہاں بھی آفت میں | یہاں سے اور زیادہ پھنسا مصیبت میں

جو نقد کچھ ہی تو مخبر کا قرضدار بنا
وگرنہ بے گنہی میں گناہ گار بنا

بیان سن کے یہ سالک اُڑے جو میرے ہوش | بسانِ صورتِ دیوار رہ گیا خاموش
ہجومِ فکر سے خون دل میں مارتا تھا جوش | کہ ناگہاں تہِ غیب سے بہ بانگ سروش

رسید مژدہ کہ ایام غم نخواہد ماند
چناں نماند و چنیں نیز ہم نخواہد ماند

روئے جنت میں بھی ہم کرکے بیانِ دہلی
اس سے ظاہر ہے نہیں خلد بسانِ دہلی

اس کے مٹنے سے ہوئی عالمِ بالا کی نمود
ورنہ تھی رشکِ فلک شوکت و شانِ دہلی

کس کا پتھر کا ہے دل کس سے سنا جاتا ہے
کون ایسا ہے کہ ہو جس سے بیانِ دہلی

محشرِ غدر سے بھی مٹ نہ سکا اس کا وجود
ہے الگ عالمِ فانی سے جہانِ دہلی

ہنستے ہیں بختِ زلیخا پہ تو یوسف وطن
دیکھ کس رتبہ کے ہیں پیر و جوانِ دہلی

ہے خط و خال کا عالم وہی اب تک گویا
ہے اسی وقت کی نکلی ہوئی جانِ دہلی

حسرتوں کا ہے مکینوں کی عجب ہنگامہ
رہے آباد اجڑ کر بھی مکانِ دہلی

مٹ گئے پر بھی تو ملتا نہیں دلی کا جواب
کوئی ڈھونڈے تو اسی پر ہو گمانِ دہلی

من و سلویٰ کے مزے سے ہو وہ کیونکر آگاہ
جس نے کھایا ہی نہ ہو نزلہ خوانِ دہلی

ہوتے ہیں دور کے بس ڈھول سہانے واعظ
خلد میں کیا ہے نہیں ہے جو میانِ دہلی

میں نے دیکھا ہے ملائک کو خریدار اس کا
میں نے چلتی ہوئی دیکھی ہے دکانِ دہلی

اس قدر خلخ و نوشاد کی تعریف نہ کر
ہمنشیں آ تجھے دکھلاؤں بتانِ دہلی

غالبؔ و نیّرؔ و ثاقبؔ سے بنا ہے گویا
بلی ماروں کا محلہ صفحاتِ دہلی

سن کے ہر شعر پہ کیونکر نہ ہوں آنکھیں نمناک
سالکؔ غمزدہ ہے مرثیہ خوانِ دہلی

ایضاً

شہرِ دہلی ہوا ہے کیوں خالی
کیوں مٹی یاں سے صورتِ آدم

زورِ بازارِ موت دیکھ کہ چین
ملک الموت کو نہیں ایک دم

ڈھیر کس جا نہیں ہی مُردوں کا
نہیں تِل دھرنے کی زمیں میں جگہ
خاکِ آسودگانِ پیشیں پر
ایک کی قبر میں گئے نو اور
قافلہ قافلہ گئے کیوں لوگ
نہیں جاتے مگر عدم کو یہ لوگ
کرۂ خاک و باد و آتش و آب
روئے اپنی کمی پہ یہ چاروں
دے دیئے اُن کو لیکے خلقت سے

کس زباں پر نہیں فغاں پیہم
مُردے کا دفن ہو بلاسے اہم
یہ نئے طور کا ہوا ہی ستم
تنگیٔ جا سے لڑتے ہیں باہم
کب ہی اتنا وسیع ملکِ عدم
اور ہی نکتہ اس میں ہی مبہم
فرطِ خلقت سے ہو گئے تھے کم
ہو گیا رحمِ خالقِ عالم
کچھ عناصر جو مل رہے تھے بہم

سپہر منشی شہاب الدین خاں مرحوم دہلوی

مرزا صابر دہلوی کے شاگرد تھے۔ زیادہ حالات معلوم نہ ہو سکے۔

مٹ گیا صفحۂ عالم سے نشانِ دہلی
نظر آتا ہی ہر اک جا پہ نگاہوں کا ہجوم
ان سے بیجا ہی ہمیں کم سخنی کا شکوہ
روز رہتے ہیں تزلزل میں یہاں کے ساکن
خوب برباد کیا رشک سے گردوں نے اسے
جی بہلتا ہی اسے سُنکے مسلمانوں کا
اس کے بچنے کی نہیں ہی کوئی اُمید اب تک

مثل عنقا ہی زبانوں پہ بیانِ دہلی
کیوں نہ ہو گرمیِ بازارِ دُکانِ دہلی
کہ ہیں خاموش مصیبت زدگانِ دہلی
آفت جاں ہیں مگر مدعیانِ دہلی
ہی جو مشہور جہاں عظمت و شانِ دہلی
گویا افسانۂ جنّت ہی بیانِ دہلی
ملک الموت کے قبضہ میں ہی جانِ دہلی

جو بلا آئی گئی پھر نہ یہاں سے پھر کر
اس کے طبقے کو جو اُلٹا ہی فلک سچ بتلا
ہو اس کا جو فصیحان جہاں سے نہ جواب
آسماں کیا کہ زمیں بھی نہیں تھمنے دیتی

کیا ہی دلچسپ ہی ہر ایک مکانِ دہلی
کوئی یونان کا طبقہ تھا بیانِ دہلی
گویا قرآں کی زباں ہی یہ زبانِ دہلی
چرخ ساں پھرتے ہیں آفت زدگانِ دہلی

اس زمیں پر نہیں بسنے کی ہی امید سپہر
آس بھی ٹوٹ گئی مثلِ مکانِ دہلی

سوزاں حکیم محمد تقی خاں مرحوم دہلوی

طبیب حاذق تھے۔ کبھی کبھی شعر بھی کہتے تھے۔ اس مسدس کے سوا اور کلام یا دیگر حالات تذکروں میں نہیں ملتے۔

ہر ایک شہر میں شور و بکا ہی دہلی کا
عجیب حال یہ جس نے سُنا ہی دہلی کا

فغاں کہ نام و نشاں کیا مٹا ہی دہلی کا
دلِ دو نیم ہی وہ اجڑا ہی دہلی کا

خطا نہ کردہ جو پامال ایک جہاں ہووے
ہماری آنکھوں سے کیونکر نہ خوں رواں ہوئے

خدا نے عرش سے تا فرش جب کیا پیدا
جو انتخابِ جہاں تھے سو ہند میں رکھا

زمیں یہ رہنے کا انساں کو جب کہ حکم ملا
رہے تھے مل کے وہیں دیکھو آدم و حوّا

کسی کا نام رکھا روم اور کسی کا شام
ہی اس مقام کا ہندوستان جنت نام

جہان آباد کے ذرہ میں تھی زر افشانی

کلاہِ زر تھی گدائی یہ زر کی ارزانی

جو آتا تیرہ دروں سنگ یہاں بدخشانی — جلا وہ پاتا یہیں ہوتا لعل رمّانی

ہر ایک خوبی و حسن و جمال اس میں تھا
کمال اہلِ کمال و رکمال اس میں تھا

بجائے زر یہاں جوہر کی تھی فراوانی — نصب تھے لعل و گہر تھا جو تختِ مرجانی
یہیں برستے تھے گوہر زابرِ نیسانی — زمیں پہ ٹھوکریں کھاتے تھے درِّ غلطانی

یہ بدرِ نورِ ضیا رشکِ مہرِ خاور تھا
یہ بحرِ جود و سخا کانِ سیم و گوہر تھا

یہ شہر وہ تھا کہ سب جامِ جم اسے کہتے — سمجھ تھی جن کو وہ رشکِ ارم اسے کہتے
یہ شہر وہ تھا کہ بحرِ کرم اسے کہتے — بجا تھا چشمۂ فردوس ہم اسے کہتے

اسی کے لینے کا شایق ہر ایک سرور تھا
یہ شہر وہ تھا کہ سرتاجِ ہفت کشور تھا

وفورِ حسن و لطافت میں اس کا تھا شہرا — یہ کانِ علم و ہنر میں تھا ایسا ہی یکتا
کسوٹی کہتے ہیں جس کو وہ شہر دلی تھا — یہاں کے سنگ میں پارس کا تھا اثر پیدا

وطن کو چھوڑ ہر اک سمت سے جو آتے تھے
اسی شہر سے سب انسان بن کے جاتے تھے

غریب پرور و کانِ کمال تھا یہ مقام — عدیل اس کا نہ تھا جانتے ہیں خاص و عام
بر آتی آرزو اُن کی جو آتے یاں ناکام — یہاں سے نام وہ پاتے جو ہوتے تھے گمنام

سندِ جہاں کو تھی عالی مقام سے اس کے
یہ اعتبار تھا عالم کو نام سے اس کے

جگر ہو ٹکڑے فسانہ ہے وہ بلا اس کا
وقار جتنا بڑھا تھا گھٹا سوا اس کا
ہر ایک مکان و مکیں خاک میں ملا اس کا
ہزار حیف کہ اب نام بھی مٹا اس کا
دعائے بد کسی ایسے ہی پُر جفا کی لگی
یقین جان کہ اس کو نظر بلا کی لگی

نہ پوچھو کجروی چرخِ پُر بلا ہم سے
چھٹایا اس نے وطن اور دلربا ہم سے
یہ سب کا دُشمن جاں ہے مگر سوا ہم سے
سزا اسے بھی ملے پوچھ کر خدا ہم سے
اس آسمان پہ ہو عرش سے بلا نازل
جلا کے اس نے کیا خاک ہے ہمارا دل

ہمارے ساتھ کہاں کی اسے عداوت ہے
ہوا جو حشر ہے برپا یہی قیامت ہے
جہان ہے تہ و بالا یہ کیسی آفت ہے
یہ خوش نہووے کہ اس کی بھی آئی شامت ہے
ہمارے نالۂ سوزاں اسے جلا دیں گے
فلک کو دیکھنا ہم خاک میں ملا دیں گے

جہان آباد کو برباد کر دیا اس نے
غم و الم کو بس آباد کر دیا اس نے
جو شاد رہتے تھے ناشاد کر دیا اس نے
خوشی کے نام کو آزاد کر دیا اس نے
یہ ہے ہمیش سے دنیا میں دُشمنِ خونخوار
اسے بھی کاش ملے سامنے ہمارے دار

سمجھ میں آتا نہیں کیسی یہ بلا آئی
کہیں یہ کس سے کہو کس کی تھی یہ گمراہی
عدول حکمی کی دلیر جو فوج یہ چھائی
ہوا ہی زشتیِ اعمال کی یہ رُسوائی
بلا یہ پورب سے میرٹھ کے جو یہاں لائے

عمل ہمارے مجسم یہ سامنے آئے

اُنھوں کے آتے ہی دہلی میں قتل عام ہوا
وہ بچے پھول کی پتی سے جن کو ذبح کیا
جو سروران حکومت تھے ڈھونڈ کر مارا
گیا زمیں سے فلک تک یہ شور و اویلا

خدا کا خوف نہ آیا وفا کو چھوڑ دیا
ستم یہ دیکھ جفا نے جفا کو چھوڑ دیا

جو ظلم آنکھوں سے دیکھا کہا نہیں جاتا
نشانِ نقشِ ازل تو مٹا نہیں جاتا
سنا جو کانوں سے اُس کو لکھا نہیں جاتا
کرے بیان جو اُس کا سنا نہیں جاتا

ہوا نہ جاتی تھی بے اذن جن کے گلشن میں
وہ خاک چھانتے پھرتے ہیں جنگل او بن میں

یہ سرکشی ہوئی میرٹھ کی فوج سے جس دم
یہاں وہ آئی تو آیا تھا سب کا ناک میں دم
نہ کارتوس کو کاٹا ہوئی تھی جو برہم
جو افسر اُن کے تھے پہلے کیا سر اُن کا قلم

ہوئے جو قتل وہ دیوانِ عام کے آگے
فرشتے چھوڑ زمیں آسمان کو بھاگے

یہاں کے جتنے تھے اوباش ملکے اُن کے سات
مگر یہ شرط ہی گر آئے کچھ ہمارے ہات
کہا بتائیں تمھیں زر کے ہاتھ آنے کی گھات
برائے نام نکالی یہ لوٹنے کی بات

جو اونچا گھر کوئی تکتے تو اُس پہ چڑھ جاتے
فرنگی اس میں ہیں یہ کہہ کے گھر وہ لٹواتے

وہ بے نیازی ہی دیکھی جو اُن کی کجرائی
عذاب جب یہ انازل زمین تھرائی
جفا و جور و ستم کی نہ واں ادا بھائی
پھر اُن کے ساتھ ہی دلی پہ اک بلا آئی

عتاب آوے تو اس پر وہاں چارا نہیں
گناہ کردہ و ناکردہ کا شمار نہیں

ہوئی جو عرش سے نازل بلا تو کس سے رکے
جو کام تھا وہ یہ اول تمام کر ہی چکے
کچھ اس کی وہاں نہیں پروا جو لاکھ ہوں سجدے
نزول سے پہلے جھکے سر سے اب جھکے تو جھکے

وہاں ہے کس کو مجالِ کلام و تابِ سخن
ولی ہیں خوف سے بیٹھے لگائے مہر دہن

یہ جوق جوق جو دہلی میں جمع تھے ظالم
کٹے ہزاروں نہ باقی رہا کوئی سالم
لڑے پھر اُن سے ہمیشہ جو ان کے تھے حاکم
جو اس میں بھید تھا اُس کا خدا ہی ہے عالم

پڑے جو گولے تو بے دین بھاگے اور ترسا
جب آسمان سے مینہ اُن پہ آگ کا برسا

اکڑ کے پنجوں کے بل جو زمین پر چلتے
تفنگ و تیغ کو چمکاتے ہر گھڑی ملتے
جو سیدھی بات کرے اُن سے اُس کو وہ دلتے
نشہ میں لاف وہ کرتے تو سُن کے سب جلتے

ہوئے تھے جو کہ مقابل ہر بے سنان و سیف
دماغ جھڑ گیا اُن کا رہا نہ باقی کیف

رعایا کو ہوا دشوار شہر کا رہنا
نہ جانتے تھے کہ ہوتا ہے کیا ستم سہنا
ہوئے خراب جنھوں نے نہ مانا تھا کہنا
بجائے اشک ہوا خون چشم سے بہنا

نہ تھی وہ قابل رحمت پڑے نہ اب پالا
جہان آباد پہ اس فوج نے ستم ڈالا

نزولِ رحم کے بدلے میں آ رہے گا عتاب
سزا عمل کی ملی ہو گئے جو خانہ خراب

نظر اُٹھا کے جسے دیکھا تھا وہ چشم پر آب | مٹا ہے نام و نشاں اب یہاں کا مثلِ حباب

ہے ذکر کیا جو کوئی آرزو بھی بر آوے
جو موت آئے تو وہ دیکھ اُن کو پھر جاوے

نکلتے کاشکے دہلی سے یہاں نہ رہنا تھا | بلائیں سہتے نہ کچھ پوربیوں سے کہنا تھا
نہ پاس اپنے زر و نقد تھا نہ گہنا تھا | نصیب اپنے لئے تھے ستم یہ سہنا تھا

کہ خاک چھانیں ہر اک قریہ کی پھریں در در
نہ پوچھے بات کوئی دیکھ بے زر و بے پر

کہاں وہ شوکت و حشمت کہاں وہ جاہ و وقار | کہاں وہ مکنت و رفعت وہ عظمتِ سرکار
کہاں وہ قدرت و ثروت وہ عیشِ لیل و نہار | کہاں وہ فرحت و عشرت وہ وصلتِ دلدار

نگاہ یاس ہے حرماں ہے چشم پرنم ہے
فغاں ہے آہ ہے نالہ ہے جوشِ ماتم ہے

ستم کہ بادِ مخالف خزاں کو لاتی ہے | بیان کیا کروں اس کا کہ پھٹتی چھاتی ہے
جو اہلِ قلعہ تھے ثروت یہ اُن کی جاتی ہے | کہ ساتھ اُن کے یہاں سب کی شامت آتی ہے

ہمارا سینہ و دل چاک ہو گیا افسوس
یہ کیسا لاکھ کا گھر خاک ہو گیا افسوس

رہی کسی کو فراست نہ نامِ دانائی | جو سرورانِ حکومت سے جنگ ٹھہرائی
خمار جاتا رہا ہے قضا نے پلوائی | حصول کچھ نہ ہوا جز ملال و رسوائی

ہوئے ہیں جمع جو نا اہل و نابکار و کمین
بلا میں ڈال کے سب کو نکل گئے بیدین

بیان کیا کروں اس کا کہ جاں ہی گھبرائی ۔ کہ موشگافی سوا کچھ نہیں ہی دانائی
بلا پہ آئی بلا پر اُنھیں نہ موت آئی ۔ جنھوں نے دہلی میں شاہی تھی نام کی پائی
نزول جب ہو بلا کا نہ کیوں زمین ہل جائے
جو چاہیے اُن کی ترقی وہ خاک میں مل جائے

تھے ایک وز فراہم جو شاہ کے فرزند ۔ کی عرض شہ سے کہ اقبال آپ کا ہو بلند
دعا قبول ہوئی آپ کی ملی یہ گزند ۔ خفا گلو ہی ہمارا اجل ہی طوق کمند
ہمارے حق میں جو ارشاد تھا سو پیش آیا
کہ اپنے سامنے سب کو عدم میں بھجوایا

اُجڑ گیا چمن آرائے گلرخاں افسوس ۔ رہا نہ گلشن و گل اور باغباں افسوس
وہ نا قدر تھا کہوں کیسا قدرداں افسوس ۔ کہ جس کی یاد میں کرتا ہی اک جہاں افسوس
چلی ہی باد خزاں ہی خزاں کی طغیانی
خدا ہی جانے کہ آفت ہی اور کیا آنی

قدیم سے جو یہاں تھے امیر اب ہیں غریب ۔ حوادث ایسے ہیں برپا کہ ہیں کمال عجیب
اب اُن کو بیٹھنے دیوے نہ کوئی اپنے قریب ۔ کہ جن کے در پہ رہا کرتے تھے ہزار نقیب
نہ سمجھے کوہ بلا جو یہاں ہی ٹوٹ پڑا
یہ آسمان ستم لو یہاں ہی ٹوٹ پڑا

چھپے زمیں میں عبرت ہے جو کہ تھے انساں ۔ مراد جن سے ہی انسان کی وہ اب ہیں کہاں
ملے ہزار جتن سے گر اُن کا نام و نشاں ۔ سو وہ بھی ایسا کہ ہو جیسے چشمۂ حیواں
بشر کی شکل میں سیرت نہیں ملی ان کو

برائے نام ہیں کہتے ہو آدمی جن کو

کہاں وہ تاج کا مالک کہاں ہے وہ دربار — کہو کدھر گئی دیوانِ خاص کی وہ بہار
اب اس کے دیکھے جو اُجڑے ہوئے ہیں در و دیوار — یہ دل میں آئے کہ سر پھوڑ اور چیخیں مار

ہے پارہ پارہ جگر کیسی دل لگا رہی ہے
بجائے اشک جو آنکھوں سے خون جاری ہے

بنا ہوا تھا جو مہتاب باغ کا گلشن — گل شگفتہ نہ ہے عندلیب وہ نہ چمن
کہاں وہ نرگسِ شہلائے نسترن نہ سمن — روا ہے اب کہیں اُس کو کہ ہے وہ دشتِ محن

چمن سے سرو کو آزاد کر نکال دیا
گلے میں قمری کے دیکھا کہ طوق ڈال دیا

صبا چمن میں اُڑا لائے ہے اپنے سر پہ خاک — جہاں تھی نرگس و لالہ نہیں خس و خاشاک
ہر ایک گل جو ہے پژمردہ باد دلِ غمناک — کیا ہے گلشنِ ہستی نے اب گریباں چاک

کریں ہیں نوحہ مچا شور بلبلانِ چمن
ملے ہیں خاک میں گلچین و گلرخانِ چمن

وہ کیا ہوئے جو یہاں تھے امیر ابنِ امیر — تھی جن کی شوکت و عظمت ہر ایک کی توقیر
جبینِ عجز جھکاتے وہاں صغیر و کبیر — سمجھ کے فخر کھڑے رہتے در پہ جم غفیر

یہ کیسا پردۂ ناموس چاک چاک ہوا
ملے وہ خاک میں دل سب کا جل کے خاک ہوا

کہاں ہے وہ دماغ اُن کا اور وہ سردار — کہ جن کو بات کے کرنے سے آتی تھی عار
نظر اُٹھا کے جو دیکھیں تو ہوتا دبر یار — لبِ دہاں اُن کو بُلانا تھا کس قدر دشوار

وہ مضطر ہو کے جو باتیں کسی کے سات کریں
کرے نہ بات کوئی اُن سے جب وہ بات کریں

ہمیشہ عطر جو پوشاک میں لگاتے تھے
تھی نکہت ایسی کہ اُس سے نہ تاب لاتے تھے
بدلتے شام و سحر جوڑے اور بساتے تھے
خجل ہو گل کفِ افسوس ملتے جاتے تھے

وہ دیکھو پیرہن آلودہ خاک پھرتے ہیں
کہاں ہیں جیب گریبان چاک پھرتے ہیں

گلے میں پھولوں کا کنٹھا سدا پڑا رہتا
وہ زلف نافۂ مشک اُس سے وہ کھلا رہتا
اور عطرِ گل بھی پھر اُس پر جدا لگا رہتا
شمیمِ عطر گریباں میں دل پھنسا رہتا

اب اُس گلو میں ہے طوق وہ بن بجائے سمن
ہے چاک چاک گریباں ہر ایک غنچہ دہن

جو نازکی سے اٹھاتے نہ گل کو جان کے بار
رہا نہ عطر ہی باقی نہ زلفِ عنبر بار
بجز نسیمِ گل اُن کے گلے میں تھا نہ ہار
چلے ہیں سر پہ رکھے اپنے بار نصف نہار

وہ پا برہنہ ہیں کانٹے ہیں اور ہے رہِ سنگ
پڑے ہیں چھالے جنھیں بار تھا حنا کا رنگ

قدم جو رکھتے نہ تھے فرش پر پلنگ سے اُتر
جگر کے ٹکڑے ہیں دیکھ اُن کو بادلِ مضطر
برہنہ پا وہ گلی کوچوں میں پھریں در در
ستم یہ ایسے ہوئے تھے کہو بھلا کس پر

بجائے عیش شب و روز اس کا رونا ہے
اب اُن کو فرشِ زمیں خاک کا بچھونا ہے

وہ نازنیں کہ نزاکت بھی دیکھ گھبراوے
کہ جن کی بسترِ گل سے بھی نیند اُڑ جاوے

گمان میں جو نہو کیا خیال میں آوے
لکھا ازل کا جو تقدیر سامنے لاوے

پکڑکے زلف کیا قتل اُن کو سنگلے سر
صبا کے چھونے سے ہوتے جو تھے پریشاں تر

اب اُن کا حال ہے ایسا خدا نہ دکھلائے
مصیبت ایسی کسی پر کبھی نہ اب آوے
رہائی جب کہ نہ قید حیات سے پاوے
صد آرزو وہ کہے کاش جان نکل جاوے

نہ دیکھی ہے کبھی آئی نہ ایسی حیرانی
فلک نے اُن کو جو دی ہے گی اب پریشانی

برہنہ پا کوئی نکلا کوئی گریباں چاک
کسی کا دیدہ گریاں کسی کے سر پر خاک
ہر ایک نبیرہ سالار زاں تھا با دلِ غمناک
تھی دشمنوں کی بھی ہر سمت سے یہ اُنپر تاک

قدم نہ اُٹھتا تھا جو وہ قدم اُٹھاتے تھے
ہزاروں ٹھوکریں کھاتے تھے گرتے جاتے تھے

وہ کون ہے جسے اس درد کا نہیں آزار
بشر وہ کونسا ایسا ہے جس کے دل کو قرار
طپاں ہے جان بلا نالہ ہائے آتشبار
لگیں ہیں آہ کی وہ برچھیاں جگر ہے فگار

جو صبر دیویں تو یعقوب ار کو دیویں
ہمارے حال کو ایوب دیکھ رو دیویں

زمانہ کوچ کا بس آگیا ہے وقتِ رحیل
قیامت آنے میں ہرگز نہ اب ہے ہے ڈھیل
جو نفخ سور لیے ہاتھ میں ہے اسرافیل
ہے کس میں جان کہو کیا کریں گے عزرائیل

حدوثِ حشر سے پہلے ہے اپنا کام تمام
قیامت آئی اگر بعد اپنے تو کس کام

رواں ہے اشک کا دریا نہیں مجالِ سخن
گئے زمین میں تھا جن سے احتمالِ سخن
وہ قدر دان کہاں سمجھیں جو کمالِ سخن
عبث ہر ایک سے کیجے نہ قیل و قالِ سخن

لگا کے مُہر دہن کو نہ فکر کر سوزاں
کسی سے بات نہ کیجے کہ ہے جگر سوزاں

ہزار شکر وہی آئے حاکم دوراں
غریب آن بسے پھر وطن میں ہو شاداں
کہ جن کے عدل سے بیکار تیغ و تیغِ زباں
خزاں میں از سرِ نو ہے بہار کا ساماں

فلک یہ عدل سدا اُن کا پائدار رکھے
قرار ایسا اُنھیں دے نہ بیقرار رکھے

ایضاً تاریخِ غدر مفسدانِ باغی

یہ ابتدائی بلا تھی جو پوربی لائے
اخیر مصرع میں تاریخ و سال کو پائے
ہے جوش گریہ سے یہ حال چشمِ سائل کا
تھی سولھویں رمضان کی جو شہر میں آئے
جو اُس کو دیکھے وہ آنکھوں سے خون بہائے
جو قطرہ اشک کا ٹپکے سو ہے لہو دل کا
۱۲ ھ ۷۴

شاطر - میر اکرام الدین مرحوم - دہلوی

کوئی عالم میں نہیں شہر بسا ان دہلی
پہلے رونا تھا انھیں تو فلکوں کا اور اب
طعنہ کیوں دیتی ہے اے بادِ بہاری اس کو
نہ تو دل کہنے میں ہے اور نہ قابو میں زباں
ہے مٹے پر بھی سوا عرش سے شانِ دہلی
بن گیا اور فلک دود و فغانِ دہلی
تجھ سے بہتر ہے ابھی تک تو خزانِ دہلی
پوچھ مت ہم سے کہ ہم اور بیانِ دہلی

غدر کو تیغ نہ سمجھوں تو بھلا کیا سمجھوں   دل پہ آتا ہی نظر زخمِ زبانِ دہلی
اہل جنت سے نہ باتوں میں ملا لطف ہمیں   نہ سُنی جبکہ وہاں ہم نے زبانِ دہلی
پہلے بہتر تھا جوانوں سے ہر ایک پیر جواں   اور اب پیر سے بدتر ہیں جوانِ دہلی
چمن خلد بڑھانا تھا الٰہی منظور   باغِ دُنیا میں نہ رکھا جو نشانِ دہلی

دیکھنا چشمِ حقارت سے نہ اس کو شاطر
ہی مٹے پر بھی سوا عرش سے شانِ دہلی

شایق۔ آغا مرزا مرحوم۔ دھلوی

فغان دہلی میں ان کو مرزا داغ کا بھائی اور شاگرد لکھا ہو کسی تذکرے میں ان کے حالات نظر سے نہیں گزرے۔

بود از دیر فلک دشمنِ جانِ دھلی   کہ چنیں کرد بہ ایں شوکت و شانِ دہلی
دل بغم چشم بخوں لب بفغانِ دہلی   وائے بر خستگی خستہ دلانِ دہلی
اہل دہلی نہ پسندند چو خلدِ فردوس   قدسیاں آمدہ بروند مکانِ دہلی
جن و انسان و ملک چوں بدو عالم ہستند   ہمہ در حلقۂ غم ماتمیانِ دہلی
بہ یمن بود یکے حاتم طائی مشہور   فخرِ حاتم شدہ اکثر بمیانِ دہلی
ہر کہ مقبول شدہ ظاہر اوگشت خراب   یافت ہرگز نہ کسے رازِ نہانِ دہلی
رونق و بزم جہاں بود بہارِ دہلی   زینتِ باغ جہاں گشت خزانِ دہلی
ماتمِ ہمنفساں شغلِ دل افگار است   واقعی اینکہ ہمیں است بیانِ دہلی
خامہ فرسائی بیہودہ نہ شاید شایق   کیست ہم پایہ کدامی ست نشانِ دہلی

شمشیر۔ میر شمشیر علی مرحوم دہلوی

کیسے کیسے ہوئے برباد مکانِ دہلی
نہ رہے ہم نہ رہا نام و نشانِ دہلی

رحم آیا نہ تجھے ای فلکِ کین پرور
کیونکہ برباد کیے تو نے مکانِ دہلی

ہوئیں برباد جو مشہور عمارات تھیں یاں
نام کے واسطے باقی ہے نشانِ دہلی

مومن و غالب و ذوق اور ظفر تھے بے مثل
جن کی اُردوے معلے تھی زبانِ دہلی

ہفت اقلیم کے سلطان تھے اس کے مشتاق
ایسے بےمثل بنائے تھے مکانِ دہلی

منتدی یاں کے جو تھے سارے جہاں کے اُستاد
سب وہ برباد ہوئے پیر و جوانِ دہلی

خاص بازار جو تھا قلعہ معلے کے قریب
واں تھی ہر جنس سے معمور دکانِ دہلی

اب نہیں نام کو واں کوئی عمارت باقی
ایسے بےنام ہوئے سارے مکانِ دہلی

ای فلک ڈر کہ جگا دیں نہ عدم میں فتنے
خوگرِ جور ہیں سب پیر و جوانِ دہلی

آسماں چال ہی چوکا جو مٹایا اس کو
لامکاں ہو کے بڑھی عزت و شانِ دہلی

خلد میں دل کہیں گھبرائے نہ ان کا رضواں
حوریں ایسی ہیں کہاں جیسے بتانِ دہلی

جو ازل میں تھا لکھا وہ ہوا سب کو درپیش
کر نہ شمشیر بیان اب تو فغانِ دہلی

شیفتہ عظیم الدولہ سرفراز الملک محمد مصطفیٰ خاں مظفر جنگ مرحوم دہلوی

خاندان بنگش کی یادگار ۱۸۰۶ء میں بمقام دہلی پیدا ہوئے ۱۸۵۵ء میں حج بیت اللہ اور زیارت روضہ نبوی سے مشرف ہوئے ۱۸۶۹ء میں جبکہ زندگی کے باسٹھ سال ختم ہو چکے تھے

دہلی میں انتقال ہوا اور درگاہ حضرت نظام الدینؒ اولیا کے جوار میں دفن ہوئے ان کی ایک کلیات جو فارسی اور اردو کلام کا مجموعہ ہے ۱۹۱۶ء میں کلیات شیفتہ حسرتی کے نام سے نہایت آب و تاب کے ساتھ نظامی پریس بدایوں میں طبع ہوئی ہے۔ فارسی میں حسرتی تخلص فرماتے تھے۔

ہائے دہلی و زہے دل شدگانِ دہلی
آپ جنت میں ہیں اور دل نگرانِ دہلی

وہی جلوہ نظر آتا ہے تصور میں ہمیں
مٹ گئے پر بھی یہ باقی ہے نشانِ دہلی

کل یوم ھو فی شان کی ہے جلوہ گری
کیا ہوا گر نہ رہی شوکت و شانِ دہلی

تھیں جو انہار بہشتی کی حکایت نہریں
وہی نہریں ہوئیں اب اشک روانِ دہلی

گرنکھیں کہ یہ دلی ہے تو ہرگز نہ پڑے
دلی والوں کو بھی دلی پہ گمانِ دہلی

دلی اب ہے تنِ بیجاں۔ تنِ بیجاں کیا خاک
جان سے جا چکے جو لوگ تھے جانِ دہلی

کس لیئے پردے سے نکلے "ارم ذات عماد"
ابھی موجود ہیں دو چار مکانِ دہلی

ربع مسکوں سے زیادہ ہے بہت وسعت میں
چاندنی چوک کہ واقع ہے میانِ دہلی

صورتیں ہو گئیں معنی جسد ارواح ہوئے
بے خبر کہتے ہیں ویراں ہے جہانِ دہلی

رند پر یہاں کے کریں رشک ثقاہت امصار
بادشاہوں پہ کریں ناز شبانِ دہلی

دل قدح۔ بادۂ محبت۔ گل و ریحاں عرفاں
کچھ نئے رنگ کے ہیں بادہ کشانِ دہلی

پیر خوش رائے اگر ہیں تو جواں ہیں خوش شرو
عجب انداز کے ہیں پیر و جوانِ دہلی

شیفتہ اور ستایش کے نہیں ہم خواہاں
یہی بس ہے کہ کہیں "ہے یہ زبانِ دہلی"

صابر شاہزادہ مرزا قادر بخش مرحوم دہلوی

بسکہ بیداد سے ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی
ہو رقم خطِ شکستہ سے بیانِ دہلی

لامکاں ہو گئے ٹوٹے سے مکانِ دہلی
بڑھ گئی عرشِ معلیٰ سے بھی شانِ دہلی

یہ وہ جا ہے کہ دکھاتی تھی سدا حشر کو راہ
چشمِ نقشِ قدمِ راہ روانِ دہلی

جس طرف دیکھیے اللہ ہی نظر آتا ہے
بڑھ گئی اور بھی ویرانی سے شانِ دہلی

موجزن اشکِ مسلسل ہیں گلی کوچوں میں
پا بزنجیر ہوئے سروِ روانِ دہلی

طالعِ خفتہ کو ہوتا ہے فسانہ۔ اُن کے
کیوں یہ کرتے ہیں فغاں غمزدگانِ دہلی

خلد تھی ان کی گلی عرشِ بریں بام اُن کا
دعویدارانِ خدائی تھے بتانِ دہلی

نرکھا چرخ نے رہنے کا وسیلہ کوئی
کیا فرشتوں کو بسائے گا میانِ دہلی

وہ گریزاں ہوئے سب اور یہ ترکش میں رہے
تھے مگر تیر و کماں پیر و جوانِ دہلی

اس کا سایہ تھا سعادت کا کبھی سرمایہ
تھا ہما سے بھی سوا زاغِ بیابانِ دہلی

لوٹ سے اور بھی بازار ہوا گرم اس کا
صاف ہے صورتِ آئینہ مکانِ دہلی

مردے تو مردے ہیں زندوں میں نہیں دم باقی
عدم آباد میں بستے ہیں کسانِ دہلی

اُن کے اُٹھنے سے یہاں بیٹھنے کو جا نہ رہی
ہند میں ظلِ الٰہی تھے شہانِ دہلی

وہ ہوئے غم سے سفید اور یہ شش کے باعث
ایک عالم میں ہیں سب پیر و جوانِ دہلی

بسکہ گلزار ہے زخموں سے تنِ ایک عالم کا
بن گئی موسمِ گل فصلِ خزانِ دہلی

اہل دہلی کی سیہ بختی کا غم ہے صابر
کہ سیہ پوش ہیں سب ظروف[۱] میانِ دہلی

صفیر دہلوی

کیا آسمان آج بد عنوان ہو گیا
عالم تمام غرقۂ طوفان ہو گیا

[۱] دہلی میں ظروف گلی عموماً سیاہ بنتے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے۔

یہ تہلکہ ایک حشر کا سامان ہو گیا | اس غم کا پار سینہ سے پیکان ہو گیا
دلی سا شہر ہائے رے ویران ہو گیا

یہ شہر بعد مکہ کے اشرف البلاد تھا | یہ شہر جملہ شہروں میں مینو سواد تھا
ساکن ہر ایک اس کا بہشتی نژاد تھا | ہر کوئی وصلِ یار کی مانند شاد تھا
تھا باغ اب اُجڑ کے بیابان ہو گیا

ہے یہ وہ شہر جس میں نہ تھا درد و غم کا نام | رہتا تھا جس میں زہرہ جبینوں کا اژدہام
شمس و قمر بھی جس کے سلامی تھے صبح و شام | جس کا سدا تھا فضل سعادت سے التزام
اب موردِ نحوستِ کیوان ہو گیا

ہے یاسمیں ہی غم سے نہ کچھ زرد اور زبوں | سوسن بھی پیٹ پیٹ کے ہوتی ہے نیلگوں
لالہ کے دل پہ داغ ہے پیتا ہے اپنا خوں | اور گل کا جیب چاک تو غنچہ ہے سرنگوں
نرگس کو اس کے سوگ میں یرقان ہو گیا

اس شہر کا تو ماہ کے دل پر بھی داغ ہے | ماہی کو کب تڑپنے سے ہر دم فراغ ہے
تھا عشرتِ بہشت سو اب رشکِ راغ ہے | تھا آشیاں ہما کا وہ اب صرفِ زاغ ہے
عاشق کے دل کی طرح سے ویران ہو گیا

وہ تخت گاہِ خاص کہ عالم میں مشتہر | شاہِ فلک بھی جس کا سلامی تھا ہر سحر
وہ سلطنت کہ مرجعِ شاہانِ نامور | وہ قلعہ جو حصارِ فلک سے بلند تر
تاراج اب بعرصۂ یک آن ہو گیا

یوں آسماں کی اس کو نظر کھائے حیف ہے | مانند مالِ مفت کے لٹ جائے حیف ہے
یوں دفعتاً ورق یہ اُلٹ جائے حیف ہے | رونے کا یہ مقام ہے اور جائے حیف ہے

کیوں یہ جہاز غرقۂ طوفان ہوگیا

ناموس اور ننگ کا تو نام تھا کہاں — بے پردہ وحجاب تھیں نیکو سیر زناں
شیطاں کی طرح ٹوٹتے تھے جن پہ بے ایماں — وہ حال جس سے مانگے قیامت بھی الاماں

دلی سا شہر حشر کا میدان ہوگیا

جاتا رہا وہ مسجدِ جامع کا امتیاز — جسمیں کہ تھی فرشتوں کو سجدے کی حرص و آز
تھی کعبہ کی مثال جہاں پنجگاں نماز — کیا پوچھتے ہو کیا کہیں تقدیرِ بے نیاز

اب وہ مکان صرفِ کرسٹان ہوگیا

یہ کیا ستم ہے چرخِ ستمگار ہائے ہائے — کیسا مٹا دیا ہے یہ گلزار ہائے ہائے
صرفِ زیاں ہے صورتِ بیمار ہائے ہائے — گر گر رہے ہیں سب در و دیوار ہائے ہائے

غم سے سحر کا چاک گریبان ہوگیا

خوبوں کے کیا ہوئے وہ خدارنگ ٹھٹھے — پژمردہ ہوگئے یہ غنچہ ہائے! لہلہے
موقوف ایک بخت ہے یاروں کے قہقہے — جاتے رہے صفیر کے بھی اب وہ چہچہے

اب ہمصفیر بلبلِ نالان ہوگیا

ضمیر مرزا مصطفےٰ بیگ مرحوم دہلوی

کس کے آگے میں کروں آہ بیانِ دہلی — چڑھ گئے دار پہ سب پیر و جوانِ دہلی
پست تھی شانِ فلک دیکھ کے شانِ دہلی — غیرتِ خلد تھا ہر ایک مکانِ دہلی
چوک میں نہر جو واقع ہے تو پوچھو اُس کی نمود — مثلِ جنت کے رواں ہے یہ میانِ دہلی
منتخب سارے جہاں کی تھی ہر اک جنس یہاں — رشکِ بتخانۂ چینی تھی دکانِ دہلی

خاک میں مل کے یہ معلوم ہوا ہم کو ضمیر
نظرِ خصمِ فلک تھی نگرانِ دہلی

طالب نواب احمد سعید خاں مرحوم دہلوی

رئیس دہلی اور جاگیردار لوہارو تھے ۱۸۳۵ء میں پیدا ہوئے ۱۹۲۲ء میں انتقال کیا مرزا غالب کے شاگرد تھے۔ کلام غیر مطبوعہ چھوڑا۔

دلی والوں کی زباں پر ہے بیانِ دہلی
اور فلک پر ہیں ملک مرثیہ خوانِ دہلی

بارے آباد ہوا پھر کے جہانِ دہلی
بنتے جاتے ہیں جو ٹوٹے ہیں مکانِ دہلی

شہر دہلی تھا عجب رشک دہ خلدِ بریں
ہمنشیں تجھ سے کروں خاک بیانِ دہلی

فتنۂ غدر کو ہنگامۂ محشر کہیے
نالۂ صور سے ملتی ہے فغانِ دہلی

سارے عالم میں پھرا اور سنی سب کی زباں
پر نہ طالب نے کہیں پائی زبانِ دہلی

ظاہر لالہ رام پرشاد آنجہانی۔ دہلوی

کیوں نہ آوارہ پھریں غمزدگانِ دہلی
کہ ہے عنقا کے نشیمن میں نشانِ دہلی

جھولیاں کیوں نہ بھریں دعیانِ دہلی
کہ عجب طرح کی زرخیز ہے کانِ دہلی

بارِ منت سے بھلا کس کا نہیں سر نیچا
کس کے سر پر نہیں احسانِ شہانِ دہلی

کوئی ظاہر میں نہ تھا اس کی خرابی کا سبب
اپنے اعمال ہوئے آفتِ جانِ دہلی

کس قرینے سے تھی آراستہ ہر جنس کی چیز
چمنستان تھی گویا کہ دکانِ دہلی

صبح پیری کے تھی کافور سے اس کو نسبت
گلِ رخسار جو رکھتے تھے جوانِ دہلی

رشکِ طوبیٰ قدِ دلجو رُخِ انور خورشید
ماہِ نو تھا خمِ ابروئے بتانِ دہلی

بند ہو جاتے ہیں شیرینیِ الفاظ سے لب
کیا زباں کھول سکیں مدعیانِ دہلی

تیرے نزدیک تو جب دادِ فصاحت کی ملے
دہن اللہ کا ہو اور زبانِ دہلی

نظر آتی نہیں صورت کوئی آسایش کی
پنجۂ مرگ میں ہے جانِ کسانِ دہلی

اک فلک اور بنا میرے ستانے کے لیئے
جب اُٹھا دل سے مرے دود و فغانِ دہلی

ایسی تصویر بتاں کو جو بگاڑا اے چرخ
کیا دلِ عاشقِ شیدا تھے مکانِ دہلی

گہہ ادھر گاہ اُدھر پھرتے ہیں دن بھر ظاہر
بن گئے سایۂ دیوارِ مکانِ دہلی

ظفر حضرت سراج الدین بہادر شاہ مرحوم مغفور بادشاہ دہلی

۲۸ شعبان ۱۱۸۹ھ م ۲۴ اکتوبر ۱۷۷۵ء میں پیدا ہوئے۔ ۲۸ جمادی الثانی ۱۲۵۳ھ م ۲۸ ستمبر ۱۸۳۷ء میں تخت نشیں ہوئے۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء میں قید کرکے کلکتے بھیجے گئے۔ ۴ دسمبر ۱۸۵۸ء کو رنگون بھیجدیئے گئے۔ دو بیویاں ایک لڑکا اور ایک پوتا ان کے ساتھ تھے۔ ایک لاکھ روپیہ ماہانہ وثیقہ ملتا تھا۔ ۷ نومبر ۱۸۶۲ء میں وہیں انتقال ہوا۔ ذوق مرحوم کے شاگرد تھے۔ ضخیم کلیات مطبوعہ ان سے یادگار رہے۔

کیا پوچھتے ہو کجروی چرخِ چنبری
ہے اس ستم شعار کا شیوہ ستم گری

کرتا ہے خوار تر اُنھیں جن کو ہے برتری
اس کے مزاج میں ہے یہ کیا سفلہ پروری

کھائے ہے گوشت زاغ فقط استخواں ہما
کیا منصفی ہے زاغ کہاں اور کہاں ہما

بالعکس ہے زمانہ میں جتنے ہیں کاروبار
شیوہ کیا ہے اُلٹا زمانہ نے اختیار

ہی موسم بہار خزاں اور خزاں بہار
آئی نظر عجیب روش باغ روزگار

جو نخل پُر ثمر ہیں اُٹھا سکتے سر نہیں
سرکش ہیں وہ درخت کہ جن میں ثمر نہیں

باد صبا اوڑاتی چمن میں ہی سر پہ خاک
غنچے ہیں دل گرفتہ گلوں کے جگر ہیں چاک
ملتے ہیں دمبدم کف افسوس برگ تاک
کرتی ہیں بلبلیں بھی فریاد دردناک

شاداب حیف خار ہوں گل پائمال ہوں
گلشن ہوں خار نخل مغیلاں نہال ہوں

نزدیک اپنے آپ کو جو کھینچتے ہیں دور
ورنہ جو باصفا ہیں خردمند ذی شعور
دیکھا تو صاف فہم میں اُن کے ہی کچھ قصور
کیا دخل اُن کو آوے کبھی نخوت و غرور

رکھتے غبار کینہ سے وہ سینہ صاف ہیں
ہر نیک و بد سے صورت آئینہ صاف ہیں

جائیں نکل فلک کے احاطے سے ہم کہاں
کوئی بلا ہی خانۂ زنداں یہ آسماں
ہووے گا سر پہ چرخ بھی جاویں گے ہم جہاں
چھٹنا محال اُس سے ہی جب تک ہی تن میں جاں

جو آگیا ہی اس محل تیرہ رنگ میں
قید حیات سے ہی وہ قید فرنگ میں

یہ گنبد فلک ہی عجب طرح کا قفس
جنبش ہو ایک پر کو تو پر ٹوٹ جائیں دس
طاقت نہیں ہی نالہ کی بھی جس میں ایک نفس
رہ جائے دل کی دل میں نہ کس طرح سے ہوس

کیا طایر اُمید کی پرواز کر سکے
محبس میں نہ اتنا دم ہو کہ پر باز کر سکے

کیا کیا جہاں میں ہو گئے شاہانِ ذی کرم
کس کس طرح کے رکھتے تھے ساتھ اپنے وہ حشم
آخر گئے جہان سے تنہا سوئے عدم
دارا کہاں کہاں ہے سکندر کہاں ہے جم

کوئی نہ یہاں رہا ہے نہ کوئی یہاں رہے
کچھ اے ظفر رہے تو نکوئی یہاں رہے

ظہیر سید ظہور الدین مرحوم دہلوی

اصلاح الدولہ مرصع رقم خان بہادر سید جلال الدین خوش نویس اُستاد ابوظفر بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے صاحبزادے تھے۔ راقم الدولہ کا خطاب تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد کچھ عرصہ تک اخبار جلوۂ طور کی ایڈیٹری کی ۴ سال تک مہاراجہ الور کے یہاں رہے اس کے بعد ۱۹ سال تک ریاست جے پور میں پولیس کی ملازمت پر ممتاز رہے ۱۶ برس نواب احمد علی خاں رونق کی عزت افزائی سے ریاست ٹونک میں وظیفہ خوار رہے۔ آخر عمر میں حیدرآباد گئے۔ مگر سوا مہاراجہ کشن پرشاد کی مقرر کردہ رقم یعنی چالیس روپے کے یا بعض دیگر عمائدین کی مالی اعانت کے پائے گاہ آصفی سے فیضیاب ہونے کی عزت نصیب نہ ہوسکی اور باوجود شرف باریابی کے آٹھ مہینے کی اُمیدواری کے بعد حیدرآباد میں ۱۷ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۹۱۱ء انتقال ہوا۔ دائرہ میر میں آپ کا مزار ہے۔

فرشتہ مسکن و جنت نشان تھی دہلی
زمیں کے پردے میں ایک آسمان تھی دہلی
جہاں میں ایک عجائب مکان تھی دہلی
غرضکہ اہلِ بصیرت کی جان تھی دہلی

یہ وہ جگہ تھی زمیں جس کی زر اُگلتی تھی
یہ خاک وہ تھی کہ اکسیر ہاتھ ملتی تھی

سوادِ ہند میں عرش احتشام تھی دہلی
بہ ایں مردمکِ خاص و عام تھی دہلی

زمیں پہ چرخ کی قایم مقام تھی دہلی | جب آیا عہدِ جوانی تمام تھی دہلی

فغاں کہ جس کو ملائک نے انتخاب کیا
ستم ہے اس کو زمانہ نے یوں خراب کیا

یہ شہر وہ تھا کہ غنچہ تھا حسن والوں کا | یہ شہر وہ تھا کہ تختہ تھا نونہالوں کا
یہ شہر وہ تھا کہ مجمع تھا خوش جمالوں کا | یہ شہر وہ تھا کہ مرجع تھا باکمالوں کا

یہ وہ مکاں تھا مکیں جسکے قیصر و جم سے تھے
یہ خطہ وہ تھا گدا جس کے فخرِ حاتم سے تھے

جہاں آباد لقب تھا نہ شاعراں کے لیۓ | جہاں کا لفظ بنا تھا اسی مکاں کے لیۓ
یہ درجے اس کے لیۓ تھے نہ آسماں کے لیۓ | کہ اس سے کام زمانہ نے دو جہاں کے لیۓ

فلک سے رتبہ میں رتبہ دو چند تھا اس کا
مقامِ عرش سے پایہ بلند تھا اس کا

نقوشِ پیکرِ ارژنگ سے تھے در و دیوار | نگار خانۂ چینی سے تھے کوچہ و بازار
مکاں مکاں سے ہویدا تھا جوشِ فصلِ بہار | بنا محلہ محلہ تھا غیرتِ گلزار

فلک صفائے عمارت پہ زہر کھاتا تھا
چمک سے ذروں کی خورشید تھرتھراتا تھا

دلِ جہان تھا دلی سے مدعا یہ ہے | نہ سمجھے دل میں تلنگانِ پُر جفا یہ ہے
کہ دل کو بولتے ہیں خانۂ خدا یہ ہے | خدا کے گھر کو بگاڑا ستم کیا یہ ہے

نہیں جہان میں واللہ اس جفا کی پناہ
جو انتقام ہو اس کا تو بس خدا کی پناہ

یہ وہ الم ہے کہ اس غم سے سب ہلاک ہوئے
ہلاک گور میں آسودگانِ خاک ہوئے
لگا کے چرخ سے بیچین تا سماک ہوئے
کفن بھی ساتھ گریباں کے چاک چاک ہوئے
نہ روزِ حشر سے کم تھی عذاب کی صورت
خدا دکھائے نہ اس انقلاب کی صورت

نہ غم سے دیدۂ نرگس میں اشکِ شبنم ہے
چٹکنا غنچہ کا گلشن میں نالہ و غم ہے
دُرِ سرشک سے چشمِ صدف بھی پُر نم ہے
تمام خانۂ گیتی سرائے ماتم ہے
جو دل خراش ہے شیون سے نغمہ بلبل کا
جو پُرزے پُرزے گریباں ہے باغ میں گل کا

جو رشکِ دیدۂ نرگس تھی چشمِ فتّانی
گھڑی گھڑی ہے فزوں آنسوؤں کی طغیانی
ہوئی ہے گریہ خونیں سے لعلِ رُمّانی
غرض کہ کشتیِ اہلِ جہاں ہے طوفانی
نہ ناخدا ہے نہ ملاح نہ کنارا ہے
خدا کی ذات کا اس بحر میں سہارا ہے

گلی گلی سے ہے آتی صدائے واویلا
دکان دکاں سے ہے گھر گھر سے حشر ہے پیدا
زمیں زمیں سے ہے اُٹھتی نوائے وادردا
مکاں مکاں سے اُٹھا غلغلہ ہے شیون کا
چہار سمت رواجِ ستم پرستی ہے
فلک سے تازہ بلا پر بلا برستی ہے

زمیں زمین کے درپے ہے خاک اُڑانے کو
رہی نہ جائے زمانہ کے سر اُٹھانے کو
مکاں مکان کے دشمن ہے کاٹ کھانے کو
ٹھکانے ڈھونڈھتے فتنہ ہیں بیٹھ جانے کو
گھروں کو دیکھ پکڑنے لگے ہیں گھر عبرت

بنے ہیں روزنِ دیوار دیدۂ حسرت

ہوئی جو شام تو شامت دُوں کی شامت ہے
نمودِ صبح قیامت پر اک قیامت ہے
بلا بلا پہ مصیبت پہ اک مصیبت ہے
گھڑی گھڑی ہے غضب لحظہ لحظہ آفت ہے

ترے ستم سے کہاں بچ کے پُرجفا جائیں
زمین شق ہو تو اب چرخ ہم سما جائیں

لباس ہے جو بدن پر اجل کا ساماں ہے
کہ آج گل سر و ساماں بھی دشمنِ جاں ہے
جو پُرزے پُرزے سلاسل کی شکل داماں ہے
تو بند بند ہیں طوقِ گلو گریباں ہے

بہارِ لالہ و گل اشکِ خوں دکھاتے ہیں
بجائے خندۂ لب زخم مسکراتے ہیں

جو ہاتھ عقدہ کشا تھے وہ بستہ کار ہوئے
جو قد کہ رشکِ صنوبر تھے وہ نزار ہوئے
جو پاؤں غیرتِ گل تھے وہ خار خار ہوئے
حنائی تلوے دلوں کی طرح فگار ہوئے

جو سینے گلشنِ خوبی تھے داغ داغ ہوئے
جو دل کہ خانۂ عشرت تھے بے چراغ ہوئے

نگاہ صورتِ تصویر رہ گئی حیراں
ہر ایک جسم بنا شکلِ قالبِ بے جاں
چھٹے یگانوں کے ہمراہ ہوش و تاب و تواں
برنگِ طائرِ پر سیدہ اُڑ گئے اوساں

مثالِ آئینہ ہر ایک چشم حیراں تھی
دلوں کی طرح سے جو زلف تھی پریشاں تھی

ہر ایک رونقِ بزمِ جہاں قتل ہوا
ہر ایک قبیلہ و ہر خاندان قتل ہوا
ہر ایک طوطیِ شیریں زباں قتل ہوا
ہر ایک بلبلِ نوشیں بیاں قتل ہوا

گھروں سے کھینچ کے کشتوں پہ کشتے ڈالے ہیں
نہ گور ہے نہ کفن ہے نہ رونے والے ہیں

نکلنا شہر سے خلقت کا بے سروساماں
وہ جانا پردہ نشینوں کا باسرِ عریاں
وہ چاک چاک گریباں لگا کے تا داماں
وہ دار و گیرِ سپاہِ بغیٔ بے ایماں

دراز دستِ تظلم ستم شعاروں کا
فلک کو پاس سے تکنا جفا کے ماروں کا

نکلتے شہر سے ہیں پر نکل نہیں سکتے
کروڑ شکل کو بدلیں بدل نہیں سکتے
ہزار چال سے چلتے ہیں چل نہیں سکتے
قدم قدم پہ ہے لغزش سنبھل نہیں سکتے

کمندِ موت نے کیا بند بند جکڑے ہیں
زمین شہر نے ایک ایک کے پاؤں پکڑے ہیں

وہ دھوپ اور وہ ریگِ تپاں وہ گرم ہوا
وہ کینہ دوزیٔ غارت گرانِ بے پروا
وہ فوج فوج ہر ایک سو سے نرغۂ اعدا
اور اُس پہ ظلم گنواروں کا اور واویلا

جو ہم سے سنتے ہیں اُس انقلاب کی باتیں
تو لوگ کہتے ہیں کرتے ہو خواب کی باتیں

وہ گل سے چہرے حرارت سے تمتمائے ہوئے
لبوں پہ آہ جگر میں الم سمائے ہوئے
وہ گورے گورے بدن خاک میں ملائے ہوئے
جفا کی تیغ سے سب زخم دل پہ کھائے ہوئے

وہ داغِ مرگِ عزیزاں وہ دشت پیمائی
وہ ریگِ خارِ مغیلاں وہ آبلہ پائی

گلوں سے جسموں پہ ایک مردنی سی چھائی تھی
وہ مہ سے چہروں پہ گویا چھٹی ہوائی تھی

غضب وہ پردہ نشینوں کی بے ردائی تھی
غرضکہ آنے سے پہلے قیامت آئی تھی

بیان کیجے نصیبوں کی کیا بُرائی کا
وہ دشت اور وہ پھرنا برہنہ پائی کا

جہاں کی تشنۂ خوں تیغ آبدار ہوئی
سنانِ نیزہ ہر ایک سینہ سے دوچار ہوئی
رسن ہر ایک بشر کے گلے کی ہار ہوئی
ہر ایک سمت سے فریادِ گیرودار ہوئی

ہر ایک دشتِ قضا میں کشاں کشاں پہونچا
جہاں کی خاک تھی جس جس کی وہ وہاں پہونچا

نہالِ گلشنِ اقبال پائمال ہوئے
گلِ ریاضِ خلافت لہو میں لال ہوئے
یہ کیا زوال ہوئے اور کیا کمال ہوئے
کمال کو بھی نہ پہونچے تھے جو زوال ہوئے

جو عطر گل کا نکلتے رہے وہ مٹی میں
جو فرشِ گل پہ تھے چلتے ملے وہ مٹی میں

کہاں وہ خسروِ عالی نظر بہادر شاہ
کہاں وہ سرورِ نیکو سیر بہادر شاہ
کہاں وہ بادشہِ دادگر بہادر شاہ
کہاں وہ داورِ والا گہر بہادر شاہ

کہاں سے باغیٔ بے دین آگئے ہی ہی
کہ نام اُس کا جہاں سے مٹا گئے ہی ہی

جہاں میں جتنے تھے اوباش و رندِ نافرجام
قمار باز و چغل خور و بدمعاش تمام
ہوئے شریکِ سپاہِ شریر و بد انجام
کیا تمام شریفوں کے نام کو بدنام

دو چند آتشِ فتنہ کو سر بلند کیا
کیا وہ کام کہ عالم کو دردمند کیا

شریر و مغوی و نا اہل سر اُٹھانے لگے
کہ گمرہوں کو رہِ گمرہی دکھانے لگے
چھپے ہوؤں کا سُراغ و نشان بتانے لگے
پکڑ پکڑ کے ستمگار خوں بہانے لگے
اُٹھائی گیرے اُچکے گھروں سے دھر بھاگے
جو کچھ کٹے تھے وہ گٹھڑی لپک کے گھر بھاگے

بدی کے تخم شقی کشتِ دل میں بونے لگے
کہ بے گناہ زن و بچہ قتل ہونے لگے
جو اہل درد تھے رو رو کے جان کھونے لگے
مسیح و خضر بھی منہ ڈھانپ ڈھانپ رونے لگے
ستونِ خانۂ نصفت گرا دیئے یکسر
چراغِ بزمِ عدالت بجھا دیئے یکسر

نہ دیندار تھا کوئی نہ دینداری تھی
ستم پرستی و جور و جفا شعاری تھی
یہ پاسداریِ ملت تو مستعاری تھی
پر اس کے پردے میں فکرِ حرام کاری تھی
غرض کہ دین کو سمجھے تھے وہ ستمگاری
نمک حرامی و محسن کشی تھی دینداری

برائے نام ستمگار دیندار بنے
جو دیندار بنے تو ستم شعار بنے
ستم شعار بنے جب تو ذی وقار بنے
جو ذی وقار بنے تو حرام کار بنے
کیا وہ ظلم کہ سر پر جہاں اُٹھا مارا
خدا پرست نہ تھا کیا کوئی خدا مارا

یہ کیسی آتشِ فتنہ لگا گئے ظالم
جہاں میں ایک قیامت مچا گئے ظالم
غرض کہ نامِ خلافت اُٹھا گئے ظالم
سبھوں کو مٹنے سے پہلے مٹا گئے ظالم
کسی پہ قہرِ خدا کا نہ آفت آئی تھی

بہ خاندانِ تمرؔ پر قیامت آئی تھی

ہزار شکر کہ دورانِ دورِ کو پر ہی
وہ آسمانِ کرم کا مہِ منور ہی

زمانہ عہد میں اُس کے ترقیوں پر ہی
سخی و سرور و ذی جاہ و داد گستر ہی

اگر نہیں تو نہو بندگی و خاوندی
اُسے درست تو ہی نسبتِ خداوندی

ظہیرؔ بیہدہ تا چند خامہ فرسائی
عبث عبث بہ تگاپو و آبلہ پائی

خیالِ ہرزہ درائی و بادہ پیمائی
نہیں پسند نہیں تیری نغمہ آرائی

زباں کو بند کر اور منہ سے کچھ نکال نہ بات
مثل سُنی بھی ہی تونے گزشتہ را صلوات

ایضاً

مل بے دہلی و زہے شوکت و شانِ دہلی
مل گئی خاک میں سب شوکت و شانِ دہلی

لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی

ای فلک اپنے گریبان میں منہ ڈال ذرا
ہائے یہ ظلم و ستم اور کسانِ دہلی

وہ قیامت ہیں فرشتوں کو لٹا دیتے ہیں
شوخ و بدمست فسوں کار بتانِ دہلی

نام کوثر کا نلو حضرتِ واعظ دیکھو
چوس جائیں نہ کہیں دو کشانِ دہلی

زمزمے بھول گئے نغمہ طرازانِ چمن
ہی ہر ایک نوحہ گر و مرثیہ خوانِ دہلی

رہ گئے کہنے کو کچھ کچھ ہیں فسانے باقی
اب نہ دہلی ہی رہی اور نہ زبانِ دہلی

فلکِ پیر نے مٹی میں ملایا سب کو
پھرتے ہیں خاک بسر پیر و جوانِ دہلی

ہیں نئے ڈھنگ نئے رنگ نئی گفت و شنید
ایک عالم سے نرالا ہے جہانِ دہلی

دلربا مہر لقا ماہ جبیں دشمنِ دیں
کیا قیامت ہیں طرحدار بتانِ دہلی

ایک سے ایک طرحدار نظر آتا ہے
عالم آشوب ہیں یہ کج کلہانِ دہلی

چرخ بد بیں یہ غضب ہے نہ انھیں دیکھ سکا
چند اشخاص تھے باقی جو نشانِ دہلی

کیوں نہ پامال ہو مردہ ہے بدستِ زندہ
جسم دوزخ میں ہے فردوس میں جانِ دہلی

خوش متاعِ سرِ بازار ہے ارزِ بازار
جوہر فرد ہے کل جنسِ دکانِ دہلی

بولتے ہیں جسے اردوئے معلیٰ احباب
ایہا الناس ہے وہ خاص زبانِ دہلی

رات دن گریہ ہے اور سنگ ہے اور سینہ ہے
اور ظہیرِ جگر افگار و بیانِ دہلی

عابد۔ سید حسین علی خاں مرحوم۔ دہلوی

سالک دہلوی کے شاگرد تھے۔

ہم نے مانا کہ ملی خاک میں شانِ دہلی
ڈھونڈیئے اب بھی کوئی شہر بسانِ دہلی

فاقہ مستی اسے کہتے ہیں کہ غارت ہو کر
پھر اسی رنگ میں ہیں پیر و جوانِ دہلی

کرتے ہیں لوگ جو دلی کے ارم کی باتیں
حوریں سنتی ہیں بصد شوق زبانِ دہلی

خونِ دل پیتے ہیں اور شکرِ خدا کرتے ہیں
یوں بسر کرتے ہیں اب بادہ کشانِ دہلی

جنسِ حسرت کے سوا کچھ نہ رہا اب باقی
لٹ گئی غدر میں افسوس دکانِ دہلی

غالب و شیفتہ و نیر و سالک ثاقب
جسم دہلی ہے تو یہ لوگ ہیں جانِ دہلی

توبہ کی عشق سے کب حضرتِ عابد تم نے
سر ہے توبہ شکن جبکہ بتانِ دہلی

عاصی۔ نواب غلام حسین خاں مرحوم دہلوی

جنتی لوگوں سے سُن سُن کے بیانِ دہلی — حوریاں کرتی ہیں جنت پہ گمانِ دہلی
عرش تک پہونچ گئے غمزدگانِ دہلی — عرش سے فرش تلک ہے جو فغانِ دہلی
غور کی جا ہے جو دل میں کوئی انصاف کرے — میر اور درد کی ہے صاف زبانِ دہلی
جبر حاکم سے جو نکلے تھے سبھی شہر کے لوگ — پا پیادہ تھے مگر تھے نگرانِ دہلی
دلی سے جو کہ نہ رکھتے تھے قدم باہر کو — دربدر وہ ہی ہیں نواب و خانِ دہلی
منہدم چرخ نہ اس شہر کو کیونکر کرتا — ہفت اقلیم کی تھا جان جہانِ دہلی

عاقل۔ نواب ضیا علی خاں مرحوم دہلوی

کیا کروں کس سے کروں آہ بیانِ دہلی — جان بن کر گئے جو لوگ تھے جانِ دہلی
جن کا مذکور سُنے سے بھی غش آجاتا تھا — کیا ہوئے ہائے خدایا وہ بتانِ دہلی
دیکھ لیں گے ارم خلد کو بھی آخر ہم — شہر تو کوئی نہیں دیکھا بشانِ دہلی
باعثِ شان تھے جو لوگ سو وہ ہی نہ رہے — اب ہی کیا ہے جو تو دیکھے ہے نشانِ دہلی

حضرتِ دہلی کے باشندے ہیں جن سے عاقل
گلشنِ خلد پہ رکھتے ہیں گمانِ دہلی

عباس۔ میر عباس مرحوم دہلوی

نقشۂ خلد تھا گویا یہ مکانِ دہلی — نہ مٹا ہے نہ مٹے نام و نشانِ دہلی

کیا ہی برباد ہوا باغ جہانِ دہلی — چشمِ حسرت سے ہی نرگس نگرانِ دہلی
اہلِ دہلی کو تو حب الوطنی نے مارا — لیئے دے دے کے درم داغ زبانِ دہلی
چشمِ بد بیں کی نظر کر گئی کام آخر کار — ایک مدت سے فلک تھا نگرانِ دہلی
میکدے جتنے تھے اس شہر کے برباد ہوئے — خونِ دل کیوں نہ پئیں بادہ کشانِ دہلی
کچھ نہ ہاتھ آیا۔ مگر ایک غمِ بے وطنی — لے گیا دہلی سے ہر پیر و جوانِ دہلی
اور کیا اس سے فلک قہر زیادہ کرتا — کہ ہوا پردہ درِ حسنِ بتانِ دہلی
مثلِ دہلی کے کہیں نقشہ نہ دیکھا ہم نے — ہی مگر روضۂ رضواں پہ گمانِ دہلی

عزیز راجہ یوسف علی خاں مرحوم دہلوی

کیجیے اے ہمنفسو خاک بیانِ دہلی — کہ فقط نام کو باقی ہے نشانِ دہلی
آنکلتے ہیں۔ سلامت رہے ملکِ پنجاب — نازمینانِ پری چہرہ میانِ دہلی
اس قدر نازشِ بیجا نہ کر اے فصلِ بہار — تجھ سے اس وقت بھی بہتر ہے خزانِ دہلی
غم سے ساکت ہیں جو باتیں نہیں کرتے سب سے — ورنہ کیا بن گئے پتھر کے بتانِ دہلی
ختم یہ بات ہے اس شہر پہ ہم میں منصف — صاف شفاف عموماً ہے زبانِ دہلی
شیفتہ ہے یہ جواں تم پہ کہے اُس گل سے — کوئی اتنا بھی نہیں دوست میانِ دہلی
قبرِ عشاق پہ استادہ ہیں کھولے ہوئے بال — نخلِ ماتم ہے ہر ایک سروِ روانِ دہلی
جامِ مُل موسمِ گل نغمہ و دیوانِ خاص — ابرِ دُربار ہوا اور بحرِ روانِ دہلی
سو برس اُس طرف اے وحشت ہر قصر خراب — رشکِ فردوس تھا ہر ایک مکانِ دہلی
کی تھی اجداد نے گلگشت بصد جاہ و حشم — ہم کو تقدیر نے دکھلائی خزانِ دہلی

دل کی تڑپن ہے زبس آفتِ جانِ مضطر
لے لے اس کو کوئی اب آفتِ بر
یوں تو اللہ کی قدرت کا ہے جلوہ ہر جا
پر جنھیں کہتے ہیں بُت وہ ہیں بتانِ دہلی
نشۂ ہر چند ہرن ہے پہ غزل کیا لکھئے
جائیے انصاف ہے اے بادہ کشانِ دہلی
سُنتے ہیں گردشِ افلاک نے غصہ جو کیا
جا بسے خلد میں سب حور وشانِ دہلی
یہ بھی تاثیر ہے ایک دورِ قمر کی ورنہ
ہم کہاں اور کہاں ماہ وشانِ دہلی
کیا بیاں کیجے اے کوچۂ جاناں تجھ سے
کوئی آباد نہ تھا شہر بشانِ دہلی
لِلّٰہِ الحمد کہ حکام کو ہے خلق پہ رحم
ورنہ رہتا نہ کہیں نام و نشانِ دہلی

ہو چکی سمع خراشی بہت اب ہو خاموش
اے عزیز اب نہیں بہتر ہے بیانِ دہلی

عزیز مرزا یوسف علی خاں مرحوم دہلوی

جنتی دیکھ کے کہتے ہیں خزانِ دہلی
ہے بہارِ چمنِ خلد ازآنِ دہلی
دہلی ایک سیف مفصل ہے کہ ہے شہر پناہ
حفظِ دہلی کے لیے طرفہ میانِ دہلی
یاں نہ ذکرِ ملکوت اور نہ بیانِ لاہوت
اور ہی کچھ ہے نگاہوں میں جہانِ دہلی
اس میں کچھ تھا کہ نہ تھا لیک بھرم تھا کتنا
غدر نے کھول دیا رازِ نہانِ دہلی
عقل چکرائے گی کہتا ہوں سن اے پیر فلک
بھڑ گیا تجھ سے اگر کوئی جوانِ دہلی
فرض دہلی کو اگر کیجئے جنت ہے بجا
کہ ہے یاں نہر رواں کاہکشانِ دہلی
نے یہ نے فاقہ ہے ہر روز تو روزہ کیسا
دیکھنا چاہیئے حالِ رمضانِ دہلی
بادہ جز خونِ جگر اور نہ ساقی جز رنج
نے کوئی میکدہ نے پیرِ مغانِ دہلی

نہر کا شہر میں کہتے تھے جسے زور اور شور
اب سمجھتے ہیں اُسے شورِ فغانِ دہلی

جو طلائی رُخِ خورشید پہ ہنستے تھے سدا
مل گئے خاک میں وہ سیم برانِ دہلی

اس احاطہ میں نہیں زینتِ آبادیٔ خلق
جسم بیجاں ہے یہ گویا نہیں جانِ دہلی

حیف صد حیف کہ جو لوگ ستایشگر تھے
اب وہی لوگ ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

لال ڈگی کہ بڑھی جس کے سبب رونقِ شہر
اب ہے بے نور وہ چشمِ نگرانِ دہلی

بند ایسے ہیں در شہر کہ کھلتے ہی نہیں
کہیے کیونکر نہ اُنھیں گوشِ گرانِ دہلی

خاص بازار نہیں چوک نہیں قلعہ نہیں
کیوں ہے اس شہر پہ خلقت کو گمانِ دہلی

چاندنی چوک کا میداں کہ پر از نعمت تھا
خاک اُس میں نہیں خالی ہے وہ جانِ دہلی

کیوں عزیز اب وہ کہاں قدرِ متاعِ خوبی
خاک آباد ہے دُنیا میں مکانِ دہلی

عیش حکیم آغا جان مرحوم دہلوی

خاندانی اور بادشاہی طبیب تھے ۔ شیریں کلام اور خندہ پیشانی تھے ۔ میاں ہدہد کو پال کر انھوں نے سب سے بگاڑ لی ۔ کیونکہ وہ اُستادوں پر حملے کرنے لگے تھے ۔ انھوں نے خود بھی مرزا غالب کے خلاف اجمیری دروازہ کے مشاعرہ میں ایک قطعہ پڑھا تھا جس کا آخر مصرعہ یہ تھا ع نگران کا لکھا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے ۔

عجیب طرح کی باغ و بہار تھی دہلی
جہاں میں غیرتِ صد لالہ زار تھی دہلی

ریاضِ قدرتِ پروردگار تھی دہلی
غرض گلِ چمنِ روزگار تھی دہلی

وہ وہ تھی ابرِ گہربار جس کو کہتے تھے
وہ وہ تھی گلشنِ بےخار جس کو کہتے تھے

بیان اس کے کروں لطف کیا میں نامِ خدا
کہیں اگر اسے فردوس ننگ ہے اس کا
وہ قطعہ روئے زمیں پر بڑا معظم تھا
نسیمِ خار سے بہتر تھی وہاں کی آب و ہوا

مشامِ جان کو بس فرحت اس سے آتی تھی
ہر اک بشر کی مزا روح اس سے پاتی تھی

مریضِ غم کے لیئے خانۂ شفا تھی وہ
جو خاک بھی تھی وہاں کی تو کیمیا تھی وہ
جہاں میں دردِ دل و جان کی دوا تھی وہ
بھلا میں کیا کہوں تم سے کہ چیز کیا تھی وہ

زمیں وہاں کی شرف آسماں پہ رکھتی تھی
فلک کی آنکھ بھی حسرت سے اس کو تکتی تھی

عجیب طرح کے تھے اس کے کوچہ و بازار
اور اس صفائی پہ تھا ایسا لطفِ نقش و نگار
ہنسے تھا آئینہ پر اس کا ہر در و دیوار
بعینہٖ جیسے کہ آئینہ میں کھلے گلزار

لگا رہے وہاں اہلِ نظر کا دیدۂ دل
نہ ہووے اور طرف دیکھ کر اسے مائل

عمارتیں تھیں وہاں کیسی کیسی شانوں کی
تھی اہلِ دیدہ کو وہ فرحت بخش جانوں کی
بیان کیجیے کیا خوبی اُن مکانوں کی
اُنھیں تھی دیکھ کے چرخِ عقل آسمانوں کی

زمیں بھی تھی تو وہاں کی اس آب و تاب پہ تھی
کہ جس کے ذرہ کو بھی چشمک آفتاب پہ تھی

ہر ایک ذرہ وہاں کا تھا رشکِ صد خورشید
وہ جائے اہلِ نظر کے لیئے تھی قابلِ دید

جو عالم اُس کا تھا وہ تو نہ دید ہے نہ شنید
جہاں میں قفلِ درِ آرزو کی تھی وہ کلید

ہر ایک طرح کا واں انبساط حاصل تھا
وہ طبقہ باعثِ آرامِ دیدۂ دل تھا

وہ کیا جگہ تھی طلسمات کا سا عالم تھا
مدام فصلِ بہاری کا واں پہ موسم تھا
بھرا ہوا وہ خوشی سے مکان ہر دم تھا
نہ دل تھا ایسا کوئی واں کہ جو نہ خرم تھا

ہر ایک فردِ بشر کو خوشی سے کام تھا واں
نجانتا کوئی زنہار غم کا نام تھا واں

ہوا وہاں کی تھی بس مشکبار عنبر بیز
ہر ایک دل کو تھی فرحت فزا طرب انگیز
ہر ایک موج تھی اس کی خوشی سے واں لبریز
تھی جان و دل کے لیئے اُس کی نکہت عشرت خیز

لطافت ایسی تھی واں کی ہوا میں نامِ خدا
کہ جس کے لطف کو کہتے تھے دیکھ صلِّ علےٰ

بسانِ آئینہ اس سوچ میں میں حیراں ہوں
کہ اُس مکان کو تشبیہ دوں تو کس سے دوں
خلافِ ادب کے ہے باغِ جناں جو اس کو کہوں
عجیب قدرتِ حق سے تھی وہ جگہ موزوں

کہ جس پہ روضۂ رضواں کو رشک آتا تھا
اور اُس کو خلدِ بریں دیکھ خار کھاتا تھا

وہاں تھا مجمعِ اہلِ کمال و اہلِ ہنر
وحیدِ عصر تھا واں کا ہر ایک فردِ بشر
رکھے تھا ہمتِ عالی ہر اک بلند اختر
کسی کو فیض ہو تھا اُن کو یہ ہی مدِّ نظر

ہر ایک طرح کا وہاں فیض اُن سے جاری تھا
ہر ایک شخص پہ القصہ فضلِ باری تھا

وحیدِ عصر تھے جو اہلِ علم و فضل و کمال ۔۔۔ جہاں میں دولتِ جوہر سے تھے وہ مالا مال
ہر ایک عقدہ کو ہر ناخن ان کا تھا حلّال ۔۔۔ اور اُن کمالوں کے تھے ساتھ صاحبِ اقبال
زمیں کی سطح پہ فیض اُن سے اک جہاں کو تھا
زمیں پہ ان کے سبب رشک آسماں کو تھا

زباں ویسی ہی اہلِ زباں ویسے ہی ۔۔۔ مکین ویسے ہی تھے اور مکان ویسے ہی
فصیح ویسے ہی تھے خوش بیان ویسے ہی ۔۔۔ خدا کے فضل سے ذی عز و شان ویسے ہی
ہر ایک طرح کا صاحب کمال تھا اُس میں
ہر ایک صاحبِ حسن و جمال تھا اُس میں

ہر ایک چیز میں اُس شہر کی لطافت تھی ۔۔۔ اور اہلِ شہر کی ہر وضع میں شرافت تھی
طبیعتوں میں نفاست تھی اور لطافت تھی ۔۔۔ ہر اک سخن میں لطیفہ تھا اور ظرافت تھی
غرض وہاں کا تھا ہر خاص و عام ویسا ہی
جہاں میں تھا وہ خطہ تمام ویسا ہی

شبِ برات کی مانند واں کی تھی ہر رات ۔۔۔ ہر ایک روز مشابہ تھا روزِ عید کے ساتھ
ہر ایک شخص تھا واں نیک ذات نیک صفات ۔۔۔ اب ہو گئی وہ جگہ ایسی موردِ آفات
کہ اُس کا نام بھی لینے سے خوف آتا ہے
خیال بھی واں جانے سے منھ چھپاتا ہے

وہ بارگاہ کہ تھا جس کا عتبہ بوسِ فلک ۔۔۔ طواف کرتے تھے جس گھر کا مہر و ماہ تلک
جہاں میں اس کی تھی عظمت سما سے تا بسمک ۔۔۔ پہونچنا حد تلک اس کی تھا فخرِ حور و ملک
تباہی اُن کی سُنا قابلِ بیان نہیں

کہوں تو کیونکہ کہوں طاقت زبان نہیں

فلک نے ان کے وہ آپس میں تفرقے ڈالے
پھنسے ہیں اُن کے سب آفت میں بوڑھے و بالے
دلِ جگر پہ پڑے پڑتے غم کے ہیں بھالے
اور اُن کو اُس پہ بھی جینے کے ہیں پڑے لالے

خبر نہ جان کو دل کی نہ دل کو جان کی ہے
اور اُس پہ ویسے ہی چھیڑ اب تک آسمان کی ہے

وہاں پہ جتنے ہوئے ذوالاقتدار تھے جو جو
متین و صاحب عز و قار تھے جو جو
یگانہ و شرف روزگار تھے جو جو
زمیں پہ باعث صد افتخار تھے جو جو

فلک نے اُن ہی کو چن چن کے پائمال کیا
اُنھیں کو موردِ صد رنج و صد ملال کیا

اب اس میں دل کو ہے مثل آئینہ کے حیرانی
کہ اس طرح کی لطافت جہاں تھی ارزانی
بسان زلف ہے خاطر کو یہ پریشانی
یہ دل میں کہتا ہوں سن سن کے وہاں کی ویرانی

الٰہی خواب تھا یا وہ خیال تھا - کیا تھا
وہ واقعی تھا کہ با احتمال تھا - کیا تھا

فلک کی آنکھ نہ تھی جن کو دیکھنے پاتی
خدا نے دی تھی اُنھیں ایسی عصمتِ ذاتی
نہ تھی مجال صبا کی جو اُن تلک جاتی
کہ نامِ غیر جو سنتے تو اُن کو شرم آتی

فلک نے بخشا ہے اُن کو لباسِ عریانی
ہے ستر اُن کے لیئے اُن کی پاک دامانی

غرض فقط میری اس داستان سے یہ ہے
مراد اُن کی بس اظہارِ شان سے یہ ہے
مآل کار میرا اس بیان سے یہ ہے
حصول شرح مکین و مکان سے یہ ہے

کہ ایسے ایسے مکین و مکاں خراب کیئے
فلک نے سب دل و جان و جگر کباب کیئے

وہ دل ہی کونسا اس غم سے جو خراب نہیں
وہ جان کونسی ہی جس کو اضطراب نہیں

وہ کون شخص ہی جو گردِ پیچ و تاب نہیں
اب آگے حال کے لکھنے کی مجھ کو تاب نہیں

کروں ہوں ختم دعا پر دیے قبول ہو وا
خدا سے عرض ہی اب یہ ہی اپنی صبح و مسا

الٰہی کر دے پھر آباد باغِ دہلی کو
مئے نشاط سے بھر دے ایاغِ دہلی کو

کر اپنے فضل سے روشن چراغ دہلی کو
دلوں سے خلق کے تو دھو دے داغِ دہلی کو

دعا ہی تجھ سے یہی ای مسبب الاسباب
کر اپنے ابر کرم سے وہ باغ پھر شاداب

انھیں مکینوں سے پھر وہ مکان ہوں آباد
رکھ امن میں اُسے اور اُس کی آل اور اولاد

الٰہی عیشِ جگر خستہ کا بھی کر دل شاد
بحق سید کونین و آلہ الامجاد

پھر اس کو ویسا ہی آباد کر خدائے کریم
بحق سورۂ یٰسین و سورۂ حٰم[1]

ایضاً

کیا کہوں اس فلکِ شعبدہ گر کی نیرنگ
متحیر ہیں سن اس حال کو اہلِ فرہنگ

دیکھ کر اس کے طلسمات سے ناعقل ہی دنگ
اُن پہ کیا سن کے ہی اس ظلم سے ہر ایک دل تنگ

شمع ساں سب کو کیا خاک جلا کر اس نے
چھوڑا بس خاک میں ایک ایک کو ملا کر اس نے

[1] حا۔م

نہیں ایسا کوئی دل جو نہیں اس غم سے دو چار
کس کے دل میں نہیں اس غم کا ہی بتلاؤ تو خار
سن کے اس حال کو سینہ نہیں ہے کس کا فگار
کون ایسا ہے جو اس غم سے نہیں زار و نزار
کونسا دل ہے جو اس غم میں گرفتار نہیں
کونسی آنکھ ہے اس غم سے جو خونبار نہیں

ڈالا اوقات میں ان اہل کمالوں کے خلل
عقدے حل ہوتے تھے جن پاس کہ مالا ینحل
قول کو جن کے سمجھتے تھے یہ قول فیصل
ان کی کیونکر نہ ہو حالت متغیر پل پل
دل سے بے چین ہیں خاطر سے پریشان ہیں وہ
کچھ میسر نہیں ہر چیز سے حیران ہیں وہ

اور سوا اس کے ہیں جانوں کے بڑے اندیشے
دل پہ پڑتے ہیں پڑے ان کے غموں کے تیشے
ڈر سے جانوں کے لگے کرنے وہ ارزل پیشے
جوتیاں بیچے ہے ان میں کوئی کوئی میشے[1]
اس پہ بھی چین نہیں جان کو بیتابی ہے
ان کی قسمت میں فقط بیخوری و بے خوابی ہے

ابر غم دل پہ ہے ہر شخص کے ایسا چھایا
چرخ نے ان پہ سنا غم کا یہ مینہ برسایا
ان کا اس چرخ ستمگر کو یہ عالم بھایا
یاں تلک دے کہ بس منہ کو کلیجا آیا
اشک دن رات بس آنکھوں سے پڑے جھڑتے ہیں
اور سات ان کے یہ کٹ کٹ کے جگر گرتے ہیں

تھے وہ جن باغوں میں اقسام کے میوے پرنور
ناشپاتی و بہی سیب و انار و انگور
اور اسی قسم کے میووں سے چمن تھے معمور
ان کی بو باس سے ہو جاتا تھا خفقان بھی دور
با اُٹھیں باغوں میں ہیں چار طرف خاک کے ڈھیر

[1] میشے بکری کی کھالیں

اور گل و غنچہ کی جا ہیں خس و خاشاک کے ڈھیر

دیکھ ہاں سبزے کا اور آبِ رواں کا عالم — اور ہی ہوتا تھا وہاں پیر و جواں کا عالم
جمع ہوتا تھا وہاں ایک جہاں کا عالم — کچھ بیاں ہو نہیں سکتا ہے وہاں کا عالم

یا وہاں کانٹوں کے اب ڈھیر پڑے رہتے ہیں
تھے جہاں پھول نجاست کے وہاں پشتے ہیں

جس جگہ رہتے تھے پریوں کے اکھاڑے دن رات — مہروش کرتے تھے واں سیر لیے ہاتھ میں ہات
اور ہر طرح کی موجود تھیں اُن کو نعمات — جز خوشی سننے میں آتی نہ تھی اُس جا کچھ بات

یا وہی جا ہے کہ انسان کا وہاں نام نہیں
اور جو ہے کوئی تو بس غم کے سوا کام نہیں

وہ پری زاد جنھیں دیکھ کے جان آتی تھی — نام سے اُن کے سدا روح مزا پاتی تھی
بیٹھے بیٹھے جو طبیعت کبھی گھبراتی تھی — اُن سے ملتے تھے تو فوراً یہ بہل جاتی تھی

خاک میں اُن کو ہر اک طرح ملایا اُس نے
ہم جگر سوختوں کو اور جلایا اُس نے

وہ نہ جو پاؤں نزاکت سے زمیں پر دھرتے — بات بھی کرتے کسی سے تو اشارا کرتے
اُن سے کچھ چپکے بھی کہتے تھے تو ڈرتے ڈرتے — مرد و زن پیر و جواں دم تھے سب اُن کا بھرتے

خاک اب چھانتے پھرتے ہیں وہ صحراؤں میں
اور ستم اس پہ کہ چھالے ہیں پڑے پاؤں میں

جامِ عشرت سے سدا رہتے تھے دن رات جو مست — اور موجود وہاں رہتے تھے ہر بادہ پرست
بزم میں اُن کی سدا اہلِ طرب کی تھی نشست — ہاتھ اُٹھائے تھی وہ سب رنج و الم سے یکدست

اب وہ غم کھاتے ہیں اور خونِ جگر پیتے ہیں
خاک جیتے ہیں مگر کہنے کو ہاں جیتے ہیں

تھا وہ جن لوگوں کے ہاتھوں کی نزاکت کا یہ حال
خواب مخمل سے کفِ پا کو تھا ہاں اُن کے ملال
بار سے رنگ حنا کے وہ ہوئے جاتے تھے لال
ہنسکے ہوتے تھے نظر گرمی سے وہ چاند کے گال

اب وہی لوگ ہیں اور بادیہ پیمائی ہے
مل گئی خاک میں سب میری و مرزائی ہے

جن کو موجود تھی جمعیتِ خاطر ہر دم
اور آرام سے شیرازۂ خاطر تھا بہم
خواب راحت سے نہ تھی جن کو کہ فرصت ہر دم
کیا کروں عیش میں اُن لوگوں کا احوال رقم

یعنی اب زلف ہی وام اُن سے پریشانی کو
آئینہ لیتا ہی مول اُن سے ہی حیرانی کو

ایضاً

مل گئی خاک میں شانِ دہلی — نہ رہا نام و نشانِ دہلی
نہیں برباد ہوا کوئی مکان — آہ دنیا میں بیانِ دہلی
ہوگیا کیا کہوں پامالِ ستم — ہائے ہر ایک مکانِ دہلی
دشتِ غربت میں پھرے چھانتے خاک — یوں فلک پیر و جوانِ دہلی؟
گر کلفت ہوئے افسوس افسوس — غازۂ ماہ رُخانِ دہلی
شان و شوکت ہوئی اُن کی برباد — جن سے تھی شوکت شانِ دہلی
کیا ہوا فائدہ ای چرخ تجھے — سچ بتا کرکے زیانِ دہلی
دیکھ کہتی تھی جسے چشمِ فلک — کھاکے سوگند بجانِ دہلی

دوسرا گلشن دنیا میں چمن
نہیں سرسبز بسانِ دہلی

سو وہ ایسی ہوئی برباد کہ ہیں
بلبلیں مرثیہ خوانِ دہلی

نخلبندِ چمنِ دہر کو کیا
ناپسند آئی تھی آنِ دہلی

یک قلم یوں جو کیے اُس نے قلم
نخلِ اُمیدِ کسانِ دہلی

قمریاں کرتی ہیں کو کو غم میں
کر کے اس طرح بیانِ دہلی

مل گئے خاک میں کیسے کیسے
ای فلک سرو قدانِ دہلی

عندلیبانِ چمن ہیں نالاں
یاد کر غنچہ لبانِ دہلی

پہنی سوسن نے ہی نیلی پوشاک
کھا غمِ ماتمیانِ دہلی

پیچ کھاتی ہی یہ سنبل۔ کر یاد
زلف پُرپیچ بتانِ دہلی

لالہ ہو داغ بہ دل کرتا ہی
یادِ خالِ پریانِ دہلی

یاد کر کے ہی نرگس حیراں
نگہِ خوش نگہانِ دہلی

خوں بدل شام و شفق ہی فریاد
زیبِ لب مسّی دہانِ دہلی

گل کھلایا یہ نیا عالم میں
بل بے نیرنگِ خزانِ دہلی

اب کہاں ہی وہ کلامِ شیریں
ہی کہاں اب وہ زبانِ دہلی

پیشہ ور ایسے کہاں ہیں پیدا
جیسے تھے پیشہ ورانِ دہلی

مل گئے خاک میں سب اہلِ کمال
مر مٹے قاعدہ دانِ دہلی

الغرض چرخ جفا کار نے آہ
خوانِ یغما کیا خوانِ دہلی

دل بھر آتا ہی خاموش ہو عیش
تجھ سے سن سن کے بیانِ دہلی

ایضاً

کیا جانے اہلِ دہلی سے کیا بات ہو گئی
جو دہلی ایسی موردِ آفات ہو گئی

تھی رات واں کی دن سے بھی روشن زیادہ تر
یا وہ ہی ہے کہ دن کی وہاں رات ہو گئی

ہر شب شبِ برات تھی ہر روز روزِ عید
یا اب وہ جا محلِ مخافات ہو گئی

یہ واردات دہلی کی وہ ہے کہ یاں تو کیا
مشہور تا بسبع سمٰوات[لہ] ہو گئی

جو سرزمیں کہ مسکنِ قدسی صفات تھی
اب اس طرح وہ وقفِ بلیات ہو گئی

نقشِ قدم کی طرح سے سب خاک میں ملے
لو اب وہ جائے دفنِ اموات ہو گئی

مت پوچھیے بگڑتے ہی دہلی کے کیا کہیں
کیا واردات خلق پہ ہیہات ہو گئی

دیکھا بقولِ حضرت سودا تو عیش بس
دنیا تمام بزمِ خرابات ہو گئی

[لہ] ہفت آسمان

ایضاً

حالِ عالم آہ کیف و کم میں کیا تھا کیا ہوا
یا اولی الابصار دیکھو دم میں کیا تھا کیا ہوا

جائے عبرت ہے کہوں کیا تم سے اے اہلِ نظر
دفعتاً دیکھو تو رنگ عالم میں کیا تھا کیا ہوا

فصلِ خوردی و جوانی تو وہ گذری چین سے
اب ہے پیری سو اس موسم میں کیا تھا کیا ہوا

جس طرح اوراق کو ہو گنجفے کے ابتری
ویسی ہی اس دورۂ عالم میں کیا تھا کیا ہوا

کیا کہوں میں تفرقہ پردازیاں اس چرخ کی
دوستوں میں اختلاط اور ہم میں کیا تھا کیا ہوا

اے دلِ ناداں تو اب اس بات کا شاکی نہ ہو
ربط باہم دیکھ جام و جم میں کیا تھا کیا ہوا

جز خداوندِ جہاں حالِ دل اپنا علیش بس
کس سے کہیے دوستوں کے غم میں کیا تھا کیا ہوا

غالبؔ۔ اسد اللہ خاں الملقب بہ مرزا نوشہ والمخاطب نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ مرحوم دہلوی

۸ رجب ۱۲۱۲ھ ۱۷۹۷ء کو اکبرآباد میں پیدا ہوئے۔ پانچ برس کی عمر میں یتیم ہوئے ۱۱ برس کی عمر میں اُنکے سرپرست چچا کا سایہ بھی سر سے اُٹھ گیا۔ خاندانی جاگیر سے سات سو روپیہ سالانہ ملتے تھے پچاس روپیہ ماہوار خاندان تیموریہ کی تاریخ لکھنے کے معاوضے میں مع خلعت و خطاب بہادر شاہ بادشاہ دہلی کے خزانے سے ملتے تھے ۱۸۵۰ء میں یہ دونوں سلسلے ختم ہوگئے تو ریاست رامپور میں آئے۔ نواب یوسف علی خاں ناظم مرحوم ان کے شاگرد تھے انھوں نے ۱۸۵۹ء سے سو روپیہ ماہوار مقرر کر دیا۔ اور قیام رامپور کی حالت میں سو روپیہ ضیافت کے مقرر کر دیئے مگر مرزا مرحوم دلی چلے آئے یہاں آکر خاندانی پنشن بھی ملنے لگی۔ ۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو دہلی میں انتقال ہوا اور حضرت محبوب الٰہیؒ کے جوار میں "چونسٹھ کھمبا" کے قریب دفن ہوئے۔ اب ان کا مزار ایک حریم کے اندر جانب غرب ہے۔ قبر کے سرہانے ایک پتھر نصب ہے۔

بس کہ فعّال ما یرید ہے آج — ہر سلحشور انگلستاں کا
گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے — زہرہ ہوتا ہے آب انساں کا
چوک جس کو کہیں وہ مقتل ہے — گھر بنا ہے نمونہ زنداں کا
شہر دہلی کا ذرّہ ذرّہ خاک — تشنۂ خوں ہے ہر مسلماں کا
کوئی واں سے نہ آسکے یاں تک — آدمی واں نہ جا سکے یاں کا
میں نے مانا کہ مل گئے پھر کیا — وہی رونا تن و دل و جاں کا
گاہ جل کر کیا کیے شکوہ — سوزشِ داغہائے پنہاں کا
گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارب ۔۔۔ کیا مٹے دل سے داغ ہجراں کا

ذیل کا قطعہ بھی مرزا صاحب نے انھیں حالات سے متاثر ہو کر لکھا ہے

قطعہ

ایک اہلِ درد نے سنسان جو دیکھا قفس ۔۔۔ یوں کہا آتی نہیں کیوں اب صدائے عندلیب
بال و پر دو چار دکھلا کر کہا صیاد نے ۔۔۔ یہ نشانی رہ گئی ہے اب بجائے عندلیب

فرحت۔ کنور کشن پرشاد آنجہانی دہلوی

کوئی مفلسی میں ہے مبتلا کوئی تنگ حالی سے خوار ہے ۔۔۔ کوئی بیکسی میں اداس ہے کوئی رنج سے تہہ بار ہے
جسے دیکھو آہ زمانہ میں وہ الم سے زار و نزار ہے ۔۔۔ ہے کوئی فلک سے شکستہ دل کوئی غم سے سینہ فگار ہے
یہ اٹھائے لوگوں نے غم پہ غم نہ حساب ہے نہ شمار ہے

ہوا چرخ دل میں نہ کچھ خجل کیا خاک و خوں میں جہاں ہل ۔۔۔ کوئی دل ہی دل میں ہے منفعل کوئی سوز الم میں ہے مشتعل
جو ہیں سو فلک سے شکستہ دل تو ہزاروں ہو گئے زیر گل ۔۔۔ کئے جور و ظلم یہ متصل کہ زمانہ غم سے ہے مضمحل
دلِ بیکسوں کی طرف سے تو ابھی اس فلک کو غبار ہے

گیا سربسر یہ اجڑ جہاں ہوا انقلاب نیا نہ یہاں ۔۔۔ نہ وہ عیش و عشرت جاوداں نہ زمیں ہے نہ وہ آسمان
کیا تو نے کیا اے آسماں گئے سب کے سب وہ چمن کہاں ۔۔۔ ہوئیں اب یہ بیکسی اداسیاں نہ وہ گل ہیں اور نہ وہ بوستاں
یہ کہاں سے آ گئی اب خزاں نہ وہ باغ ہے نہ بہار ہے

یہ اٹھائے صد رنج و غم کہ ہیں زندگی سے بھی تنگ ہم ۔۔۔ کیا سو فلک نے بھی بند دم کوئی اور جیتے ہیں دم کے دم
کیا غدر چرخ نے یک قلم ہوا مرد و زن پہ کیا ستم ۔۔۔ رہیں کیوں نہ اشک سے چشم نم ہوا کیسا دہلی میں ہائے غم
ہمیں روز اسی کا ہے ایک الم کہ اجڑ گیا یہ دیار ہے

کروں کیا میں کثرتِ غم بیاں کہ الم میں بند ہوئی زباں
کہوں کس سے کون ہے رازداں مرے غم کی طول ہے داستاں
پڑا غمکدہ میں ہوں نیم جاں کوئی ہم نفس ہے نہ مہرباں
یہ بلا ہیں غم کی گرانیاں کہ ہے زندگی سو خفیف جاں
مجھے چھوڑ کر گئی ہے اجل کہاں جہاں سانس لینا بھی بار ہے

نہ تھا اندنوں کا خیال جب وہ مزے سے گذرے تھے روز و شب
ولے کیجے دل میں جو غور اب تو جہاں کی طرز ہے کچھ عجب
کوئی دل میں اپنے تھا پُر طرب کوئی سو خوشی سے تھا خندہ لب
جو خوشی سے رہتے تھے خندہ لب وہ ہیں غم کے ہاتھوں سے پُر تعب
پڑے یاس بیکسی الم میں سب نہ تو صبر ہے نہ قرار ہے

نہ اداس غم میں ہو جس قدر نہ قلق سے نالاں ہو ہر سحر
تجھے کچھ خبر بھی ہے بے خبر کہ یہ بخت بد کا ہے سب اثر
نہ پھر افغاں ہے تو مفت سر نہ فلک کے جوروں سے نالہ کر
کہاماں فرحتِ نوحہ گر نہ الم میں تنہا ہو چشم تر
نہیں خوب رونا یہ سربسر کہ جگر پہ غم سے بخار ہے

قمر حکیم غلام رسول خاں مرحوم دہلوی

کیا کروں دوستو میں تم سے بیانِ دہلی
عشق میں قلعہ کے جاتی رہی جانِ دہلی
کیا ہوا مٹ گیا گر نقشۂ دلی یارو
شہر اب بھی کوئی ہوگا نہ بسانِ دہلی
لے گیا ہے فلکِ پیر اٹھا کر شاید
جو فرشتوں کو ہے گردوں پہ گمانِ دہلی
نہ رہا کوئی خدایا کریں کس کی تعریف
چاندنی چوک دریبہ نہ جوانِ دہلی
چرخ بد بیں سے خدایا یہ بچیں گے کیونکر
اب یہ باقی جو ہیں دو چار جوانِ دہلی
سچ ہے جب تک ہوں شاگردِ قمر اہلِ اودھ
کیونکہ پیدا کریں وہ لوگ زبانِ دہلی

کامل مرزا باقر علی خاں مرحوم دہلوی

تمام گلشنِ عیش و سرور تھی دہلی
تمام مطلعِ خورشیدِ نور تھی دہلی
تمام عشرت و فرحت ظہور تھی دہلی
تمام غیرتِ صد کوہِ طور تھی دہلی

ہر ایک کوچہ یہاں کا تھا اک مکانِ عیش
یہ شہر تھا کہ الٰہی کوئی جہانِ عیش

ملک صفات تھا یاں کا ہر ایک فردِ بشر
یہاں کے عام کو تھا فوق خاصِ دنیا پر
برا ہی یاں کا زمانے کے خوب سے بہتر
یہاں کے نام سے بکتا تھا مس بھی زر ہو کر

یہ فوجِ باغیہ کیا شہر میں خدا آئی
کہ قہر آیا غضب آیا اک بلا آئی

یہاں کے لوگوں کی کٹتی تھی عمر عشرت میں
پڑے ہوئے ہیں وہی آج رنج و حسرت میں
جو روز عیش میں گزرا تو شب مسرت میں
پھنسے ہیں غم میں گرفتار ہیں مصیبت میں

وہ شاہزادے کہاں اور وہ بادشاہ کہاں
رہا جو کوئی تو وہ مرتبہ وہ جاہ کہاں

یہ قلعہ رشکِ گلستانِ رضواں تھا
یہ قلعہ تھا کہ خدایا کوئی پرستاں تھا
یہ قلعہ خلد تھا اس میں ہر ایک غلماں تھا
یہ قلعہ پیکرِ دنیا کے واسطے جاں تھا

نہ رہنے والے رہے اور نہ وہ مکان رہا
فقط دکھانے ہی کے واسطے نشان رہا

سنے جو کوئی تو ہاں دردِ دل عیاں کیجے
صدائے طائرِ گم گشتہ آشیاں کیجے

حیات بخش کا گر ماجرا بیاں کیجے — تو چاہیئے کہ بہت نالہ و فغاں کیجے

یہ وہ جگہ ہے کہ جنت کو جس سے غیرت آئے
جو دیکھیں حور و ملک بھی کبھی تو حسرت آئے

وہ لال پردہ کہ تھا جس سے احتشام عیاں — خوشی سے خسرو پرویز ہو جہاں قرباں
عوام کو تو وہاں جانے کی مجال کہاں — کہ خاص خاص ہی جاتے تھے بس تو سجدہ کناں

جھکے ہی رہتے تھے جس جائے اک جہان کے سر
قدم بھی اب نہیں دھرتا ہے واں کوئی جاکر

یہ چوک وہ ہے کہ میلہ تھا جس جگہ ہر روز — یہیں تو رہتے تھے مہ طلعتانِ دل افروز
نظر کو ہوتی تھی کیفیتِ سرور اندوز — جدھر کو دیکھئے تھی اک بہارِ کلفت سوز

نشان بھی نہیں اب تو ہجومِ خلقت کا
بنی ہے وہ ہی جگہ بس مقام عبرت کا

یہ وہ ہے مسجدِ جامع کہ جس میں اک جہاں — نماز کے لیئے آتا تھا دور دور سے واں
تبرکات جو اس میں تھے کیا ہوں ان کا بیاں — ادب سے کرتے تھے اس کی زیارت اہل زماں

وہ اس کی رونق بازار چار سو مت پوچھ
کہ ہم سے ہو نہیں سکتی ہے گفتگو مت پوچھ

نہ دیندار تھی یہ فوج اور نہ دینداری — سیاہ رووں کو آتی تھی بس سیہ کاری
نہ جانتے تھے وہ کچھ بے خبر ستمگاری — حرام خوروں کو ہردم تھا شغلِ میخواری

تمام نامۂ اعمال کو سیاہ کیا
ملایا خاک میں سب شہر اور تباہ کیا

وہ لوگ سیکڑوں رہتے تھے جن کے ساتھ سوار — کیا پیادہ اُنھیں اے سپہرِ نا ہنجار
اٹھائیں سر پہ وہ گٹھری کا کس طرح سے بار — اُٹھانا ایک قدم کا بھی جن کو ہو دُشوار
تہِ زمین جگہ چاہیئے اماں کے لیئے
دُعائیں مانگتے ہیں مرگِ ناگہاں کے لیئے

نہ چھپے کوئی دم اور نہ تھے کوئی آن — فسردہ دل ہیں جو کرتے تھے عیش میں گزران
ٹھکانے ہوش ہی ہیں نے بن آتے ہیں اوسان — ذلیل و خوار ہیں پھرتے ہیں جا بجا حیران
فلک نے پھینکدیا ہی کہاں کہاں اُن کو
بجائے زمزمہ ہی نالہ و فغاں اُن کو

الہی بھاگ کے یہاں سے کوئی کہاں جاوے — کوئی نظر میں ٹھکانا نہیں جہاں جاوے
کوئی جگہ نہیں جس جا پہ با اماں جاوے — اگر زمین پھٹے تو وہاں سما جاوے
دکھائی دیتا ہی ہر ایک عدوئے جاں اپنا
بنا ہی دُشمنِ جانی یہ آسماں اپنا

کہاں تلک کوئی اس غم کی داستاں لکھے — کہاں تلک کوئی کیفیتِ فغاں لکھے
کہاں تلک کوئی یہ دردِ خونچکاں لکھے — کہاں تلک کوئی بیدادِ آسماں لکھے
دُعائے کاملِ غمگیں ہو مستجاب خدا
کہیں ہوئی نہ ہو کوئی جگہ خراب خدا

ایضاً

مٹ گیا پر نہ مٹا نام و نشانِ دہلی — لب پہ دہلی ہی تو نظروں میں ہی شانِ دہلی
اگلے عیشوں کا کہیں چرخ عوض لیتا ہی — اب مصیبت میں پڑے ہیں جو کسانِ دہلی

منہ کو اُبلا ہوا آتا ہی کلیجہ ہی ہی
ہمنشیں کیونکہ بھلا کیجیے بیانِ دہلی

جی بہارِ چمنِ دہر پہ کیونکر دھریئے
کہ نظر آتی ہی افسوس خزانِ دہلی

غم دیئے رنج دیئے اپنی گرہ سے ظالم
چرخ کیا تو نے لیا کرکے زیانِ دہلی

اب جو تعریف کرے کوئی تو حسرت سے کہوں
تو نے پہلے بھی کبھی دیکھی تھی شانِ دہلی

ضبطِ گریہ تو یہ دلّی نے کیا ہی گویا
نہیں پائی گئی یہ نہرِ روانِ دہلی

خانۂ کعبہ کو اب حضرتِ کامل چلیئے
رہنے کا اب نہ رہا لطف میانِ دہلی

ایضاً

مٹ گئے ہائے مکیں اور مکانِ دہلی
نہ رہا نام کو بھی نام و نشانِ دہلی

سہمے سہمے نہ ہیں کیونکہ مقیمانِ فلک
کہ فلک ہی ہدف تیر فغانِ دہلی

ہمتو انسان ہیں جی کیونکہ رہے بن روئے
کہ فرشتے بھی ہوئے مرثیہ خوانِ دہلی

جیسے فارس میں خلاصہ ہی زبانِ شیراز
ویسی ہی ہند میں ہی پاک زبانِ دہلی

اس کی ویرانی میں ایک بات یہ دیکھی ہم نے
مٹ گئے پر بھی تو باقی ہی آنِ دہلی

جسمِ چرخ نہ انجم سے بنے آبلہ دار
گر نہ ہو درپئے بربادیِ شانِ دہلی

بسکہ ہنگامہ طلب تھا یہ مکان پہلے سے
فتنۂ حشر بھی ہووے گا میانِ دہلی

جو مکیں رہ گئے بے گور و کفن مر مر کر
ڈھانپنے پردہ کرے ان پہ مکانِ دہلی

غالب و سالک و ثاقب ہی نہیں ہیں غمگیں
کوکبِ خستہ بھی کرتا ہی فغانِ دہلی

لطف میر لطف علی مرحوم لکھنوی وارد دہلی

حیف ہے اُٹھ گئے کیا پیر و جوانِ دہلی
خاک باقی نہ رہا نام و نشانِ دہلی

چہچہے بلبلوں کے رہتے تھے دن رات جہاں
مسکنِ فاختہ ہے اب وہ مکانِ دہلی

ہر روش پر ہیں خراماں اب اُسی طرح سے غیر
جیسے گلگشت میں تھے سروِ روانِ دہلی

اب تو ایک ایک پہ گزر جاتے ہیں گھر میں دو دن
جو غریبوں کو دیا کرتے تھے خوانِ دہلی

رہ گیا قالبِ بے نور فقط آنکھوں میں
ملک الموت اُڑا لے گئے جانِ دہلی

سُن کے ہر طرز کو اطراف و جوانب والے
وجد کرتے تھے جو ہوتا تھا بیانِ دہلی

اس قدر گریہ و زاری میں ہیں اب پس ماندہ
جس سے گردوں پہ گئی آہ و فغانِ دہلی

جلوہ گر رہ گئے ہیں چند یہاں صاحبِ دل
مثلِ خورشید وہ روشن ہیں میانِ دہلی

نور سے قدرتِ باری کے ضیا دین کو ہے
ورنہ ہیں بے حس و حرکات کسانِ دہلی

اہلِ حرفہ کے سوا چین کسی کو بھی نہیں
پھرتے ہیں سب متردد پئے نانِ دہلی

اُٹھ گیا لطفِ محبت نہ رہا دل کو قرار
کون ہے جس کو نہ پہونچا ہو تکانِ دہلی

مبین حافظ غلام دستگیر صاحب مرحوم دہلوی

پسندِ خاطرِ ہر خاص و عام تھی دہلی
طلسمِ دل کش و جنت مقام تھی دہلی

تمام ملک میں بس نیکنام تھی دہلی
گلِ خوشی سے معطر تمام تھی دہلی

اُجاڑا ایسا چمن جس کے غم سے دل ہے خوں

مٹے خزاں کی ہوا خاک میں ملے گردوں

بلا بلا پہ ہی نازل خراب ہی دہلی — تباہ ہو گئی کیسی شتاب ہی دہلی
ستم ہی مورد ظلم و عتاب ہی دہلی — ہزار حیف کہ وقف عذاب ہی دہلی

ہوا جو دیدۂ غور غم سے سرخ کیا ہی عجب
کہ تارِ اشک ہی تارِ شعاعِ مہر ہیں اب

مثالِ خلدِ بریں بے مثال تھی دہلی — گل کمال سے پُر یہ کمال تھی دہلی
سپہرِ اوجِ تجلی مآل تھی دہلی — غبارِ غم سے صفا مہ جمال تھی دہلی

چمن طراز یہ دہلی فلک کو خار ہوئی
نیازِ برقِ فنا نزہتِ بہار ہوئی

یہ شہر وہ تھا نہ تھا غم خوشی کی تھی کثرت — یہ شہر وہ تھا نہ تھا رنج تھی عجب راحت
یہ شہر وہ تھا کہ بنتے تھے گلشنِ عشرت — یہ شہر وہ تھا کہ ہوتی تھی دل کو یاں فرحت

ملی وہ خاک میں صورت کہ رو رہا دل ہی
مٹی وہ شکل کہ ہر خشت فردِ باطل ہی

یہ شہر وہ تھا کہ جانِ جہاں تھا اس کا خطاب — یہ شہر وہ تھا کہ جنت نشاں تھا اس کا خطاب
یہ شہر وہ تھا کہ آرامِ جاں تھا اس کا خطاب — یہ شہر وہ تھا کہ گوہر فشاں تھا اس کا خطاب

کیا حوادثِ دوراں نے اس کو بھی پامال
یہ صادق آئی مثل ہر کمال کو ہی زوال

یہی تھا رشکِ جناں شہر اب ہی خارستاں — یہی تھا حسن کدہ شہر اب ہی صرفِ خزاں
یہی تھا عیش وطن شہر اب ہی جو ویراں — یہی تھا حورستاں شہر اب ہی وحشتستاں

یہ شہر خلد تھا ویرانیوں کا اب گھر ہے
جسے بہار ہے اُس کو خزاں مقرر ہے

یہ وہ جگہ تھی یہاں سے قدم نہ اُٹھتا تھا
یہ وہ جگہ تھی کہ غم تھا نہ کوئی بھی اس جا
یہ وہ جگہ تھی مسافر وطن تھا نام اس کا
یہ وہ جگہ تھی کہ ہر درد کی بہم تھی دوا

ہوا کچھ ایسی چلی خاک میں ملا یہ شہر
خرابہ و الم آباد بن گیا یہ شہر

یہاں کا روز تھا ہر روز روزِ عید جہاں
یہاں کی شام تھی چوں زلفِ عنبرین بتاں
یہاں کی شب تھی شبِ قدر ماہِ نور افشاں
یہاں کی صبح تھی ہم نورِ عارضِ خوباں

یہ دہلی وہ تھی کہ جس سے جہان روشن تھا
یہ شہر وہ تھا کہ نام اس کا نورِ مخزن تھا

ہر ایک شام یہاں کی تھی شامِ مشک ایجاد
یہاں کی آن تھی آنِ سمن‌بر نوشاد
یہاں کی شب شبِ راحت تھی روز روزِ داد
یہاں کی ہر گھڑی پُرعیش تھی طرب آباد

خدا ہی جانے اسے بد دعا لگی کس کی
کھلا ہنسی پہ لبِ حرفِ غم مٹی یہ ہنسی

عمارتوں سے بنا تھا طلسم خانہ گھر
ہر ایک خشت تھی آئینہ اور گِل عنبر
نہ جسم خانہ میں آتی وہاں سے پھر کے نظر
بہشت خانہ تھا ہر خانۂ صفا پرور

فلک نے ڈھایا ستم شہر یہ خراب ہوا
عذاب کا بھی فرشتہ یہاں پر آب ہوا

یہاں کے لوگ تھے علم و ہنر میں سب کامل
یہ تھا وہ ملک کہ تھی اس سے جملہ شئی حاصل

حکیم و شاعر و عالم مہندس و عاقل
سبھی تھے جمع یہ تھا شہر دید کے قابل

ہزار حیف کہ بن بن کے بگڑیں تصویریں
ملیں گناہوں کی محشر سے پہلے تعزیریں

ہوا زمین کے ماتم میں چرخ نیلی پوش
ہر ایک کوچہ بھی یہاں کا تھا حجلہ خاموش
کہاں وہ بزمِ نشاط اور کہاں خوشی کا وہ جوش
ہر ایک دل سے ہجومِ قلق ہے ہم آغوش

یہ فرطِ جنبشِ مژگاں سے حال روشن ہے
خوشی کا مردمکِ چشم کرتی شیون ہے

خجل تھا جن سے ہر ایک گل وہ ایسے خار ہوئے
مثال سبزۂ بیگانہ ہائے خوار ہوئے
بسانِ ابر گہر بار اشکبار ہوئے
قرار دل کا گیا غم سے بے قرار ہوئے

وہ کم ہے ذرہ سے جو شکل آفتاب سی تھی
وہ غرق خوں کفِ نازک ہے جو گلاب سی تھی

یہ وہ جگہ ہے کہ جس پر برستی ہے حسرت
یہ وہ جگہ ہے کہ حیراں ہے دیدۂ حیرت
یہ وہ جگہ ہے رلاتی ہے کثرتِ عبرت
یہ وہ جگہ ہے جسے کہیئے محشرِ آفت

یہ وہ جگہ ہے فرشتوں کی جان ڈرتی ہے
یہ وہ جگہ ہے کہ دم مرگ جس کا بھرتی ہے

ہر ایک سو ہے یہ غارت گری سے ویرانہ
کہ مثل دیدۂ گریاں ہے ہر درِ خانہ
رلا رہا ہے فرشتوں کو بھی یہ افسانہ
نہ وہ ہیں گھر نہ وہ محفل نہ شمع و پروانہ

بنا ہے گنج شہیداں بسانِ خرمنِ گل
فرشتے نعشوں پہ اب نالہ کش ہیں جوں بلبل

جو ہائے پھولوں کے گنٹھے کو کہتے تھے بھاری — انھیں نصیب ہے طوق کرتے ہیں زاری
یہ اُن کی نازکی اور حیف قید کی خواری — دموں پہ آن بنی جان سے ہے بیزاری

وہ روکے کہتے ہیں زنداں سے کیونکہ ہوں باہر
کہ ہم کو روکے ہے زنجیر پاؤں پڑ پڑ کر

فلک نے چھین لیا ہائے جان کا آرام — سحر ہے شعلہ فشاں پیکرِ بلا ہے شام
وہ فتنہ زا ہے زمیں خوش نہیں ہے کوئی مقام — خوشی کی کیا ہو خوشی غم سے جو کہ ہو ناکام

اُداس پھرتے ہیں کوئی خوشی نہیں بھاتی
یہ دل پہ غم ہے کہ لب پر ہنسی نہیں آتی

قیامت آئی قیامت ہے کس لئے پہلے — دکھائے کس لیئے قسمت نے حادثے ایسے
جو غم نہ سہنے کو جی چاہے آنکھ سے دیکھے — کہاں تلک کوئی روئے کہاں تلک پیٹے

کہیں پدر ہے تڑپتا کہیں پسر بیتاب
غضب ہے تفرقہ پرداز چرخ خانہ خراب

جو انتخاب جہاں میں تھے نازنیں دلبر — فلک سے کہتے ہیں وہ کھلا کے اپنے دیدۂ تر
ستم یہ کیسا ہے یہاں نیند آئے اب کیونکر — یہ سنگ خارہ کا تکیہ یہ خاک کا بستر

الٰہی خاک میں مل جائے گردشِ ایام
گھڑی گھڑی ہے قیامت کی دشمنِ آرام

جو یاد آئے شبستانِ عیش کی لذت — نہ ہو نصیبِ دل و جاں کبھی گلِ راحت
نہیں ہے رونے سے دن رات کے ذرا فرصت — ٹپکتے اشک ہیں ہر دم برستی ہے حسرت

وہ طرزِ گریہ کہ روتا ہے جس پہ ابرِ بہار

وہ اضطراب کہ تڑپے ہی برق سو سو بار

گھر ایسے لٹ کے ہوئے ہیں خراب کیا میں کہوں — کہ جیسے خشک ہوں بے اشک دیدۂ پُرخوں
نہ زر نہ سیم نہ پوشاک نے دُرِ مکنوں — لبوں پہ آتے ہیں اب نالہ دلِ محزوں
جو دُر فشاں تھے کفِ دست ہیں حرف آگیں
گُہر جو دیتے تھے کوڑی بھی اُن کے پاس نہیں

وہ لوگ جن کے دروں پر ہجومِ خلقت تھا — اور اُن کے نام سے زندہ تھا نامِ حاتم کا
وہ دربدر ہوئے ایسے تباہ اور رُسوا — کہیں زمین پہ اُن کو ملی نہ امن کی جا
فلک کو دیدۂ حسرت سے بھوک میں دیکھا
ہلالِ چرخ کو سمجھے وہ نان کا ٹکڑا

جو لوگ دیتے تھے زر ان کے ہارے پھیلے ہات — رُلا رہی ہے اب ایسوں کو مفلسی ہیہات
دموں پہ آن بنی اُن کے اور بگڑی بات — فقط ہے گوشۂ تنہائی میں خدا کی ذات
ہزاروں جن کے تھے نوکر اکیلے پھرتے ہیں
وہ رو کے اُٹھتے ہیں ناطاقتی سے گرتے ہیں

وہ ازدحامِ غم و یاس و حسرتِ پیہم — وہ دل ہے غمکدہ جس میں خوشی کا ہے ماتم
دکھا رہا ہے فلک وقتِ صبح روئے ستم — بنا ہے چشمۂ حسرت ہر ایک دیدۂ نم
نصیب کنجِ مصیبت میں آہ و زاری ہے
ہزار طرح کی آفت ہے بے قراری ہے

خدا کی شان جو رکھتے تھے چوبدار نقیب — بنایا طالعِ بد نے ہے اُن کو ایسا غریب
نہ فرق نوکر و آقا میں اب ہے وائے نصیب — چھپاتے پھرتے ہیں منہ وہ بنے ہیں شکلِ عجیب

پھر آئی کوچۂ رسوائی میں ہے اب تقدیر
ہر ایک در پہ ہیں دریوزہ گر امیر و کبیر

جو پاؤں خوگرِ گل تھے نثارِ خار ہوئے
جو دل کہ موجدِ راحت تھے بے قرار ہوئے

جو ہاتھ پُر تھے نزاکت سے وہ فگار ہوئے
جو لوگ عیش پہ نازاں تھے اشکبار ہوئے

بنی کچھ ایسی دموں پر کہ آہ بھرتے ہیں
اجل کے نام سے ڈرتے تھے جو وہ مرتے ہیں

دوشالہ پوش تھے جو بے کفن زمیں میں گئے
بجا ہے آنسوؤں پہ چشمِ فلک بھی گر روئے

جو قصر رکھتے تھے بے گورِ خاک میں وہ ملے
یہ وہ ہے غم کہ گریبانِ جامہ ہے ٹکڑے

نشانِ گور میسر نہ خاک پر ہے چراغ
چراغِ گور کے بدلے ہے دل کا روشن داغ

نہ آب و دانہ اسیرانِ غم کو ملتا ہے
بجائے آب ملے اشک رونے کی جا ہے

الٰہی یہ قفسِ چرخ رنج افزا ہے
غذا ہے غم کی شب و روز حال ایسا ہے

نہ شیر خواروں کو ملتا ہے شیر وائے غضب
زبان پھیرتے معصوم ہیں لبوں پر اب

نہ دیکھا تھا جو ستم وہ فلک سے اب دیکھا
پدر کے سامنے بیٹے کو قتل ہائے کیا

یہ وہ ہے حادثہ جس سے جگر بھی ٹکڑے ہوا
غم آئے یاد نہ کیونکر جنابِ اصغر کا

یہ کربلا کا نمونہ دکھاتی ہے دہلی
پدر کو نعشِ پسر پر رُلاتی ہے دہلی

اگر ہو دفترِ محشر تو ہوئے صرفِ بیاں
نہیں زبانِ قلم کو ہے اتنی تاب کہاں

بنا ہی چشمۂ غم ہائے دیدۂ گریاں ۔ جگر ہی ٹکڑے یہ وہ واقعہ ہوا ہی عیاں

نصیب دہلی کے چمکیں الٰہی ہو آباد
ہر ایک کوچہ ہو رشکِ صبا یغ بہزاد

ایضاً

دل غنی رکھا سخاوت پہ نہ زرداروں نے ۔ شکر نعمت نکیا ہم سے بد اقبالوں نے
گھر سے بے گھر جو کیا ہی تو انھیں چالوں نے ۔ پھینکا صحرائے پُر آفت میں انھیں چالوں نے

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

ہائے کیا کیا نہ زمانے کے بیئے مکروہات ۔ ناچ اور رنگ میں دن رات گزاری اوقات
عشق میں محو رہے بھول گئے صوم و صلوات ۔ زر کی اُلفت میں ادا ہی نہ کیئے حج و زکوٰت

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

گم ہوئے دام یہ درم غم کی خریداری ہے ۔ جابجا دامِ مصیبت کی گرفتاری ہے
ظلم جو جو کرے یہ اُس کی گنہگاری ہے ۔ اب یہ کیوں جوش شکایت کی دل آزاری ہے

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

مے کے بدلے ہمیں خونابۂ دل آہ ملا ۔ دل کباب آتش عصیاں سے قیامت ہی ہوا
عیش مرحوم کا ماتم دل گریاں نے کیا ۔ دن بُرے آئے نتیجہ ہے بُرائی کا بُرا

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

مجمعِ وعظ سے تھا ہر گریزاں یہ دل — تھی حسینوں کے فسانے پہ طبیعت مائل
انتقامِ عملِ بد سے رہے ہم غافل — خاک ہے چین فلک سے ہیں بلائیں نازل

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

وائے ناکامیِ قسمت رہی غفلت ہر دم — نیک کاموں سے رہی ہائے یہ نفرت ہر دم
بہ حسینانِ جہاں سے رہی صحبت ہر دم — تھی شبستانِ خرابات سے اُلفت ہر دم

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

بے سبب کاہے کو دیتی ہے یہ گردشِ تقدیر — ہیں سزاوارِ جفا یا دہی ہر ایک تقصیر
کیا زباں میں ہوا اثر اور دعا میں تاثیر — یعنی ہر جرمِ گزشتہ کی عیاں ہے تعزیر

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

کنجِ تنہائی میں کرتے نہیں غمخواریِ غم — چشمۂ اشکِ ندامت ہیں بنے دیدۂ نم
ساغرِ مے کے عوض لب پہ ہے توبہ ہر دم — عیش جتنے تھے کئے اُتنے ہوئے رنج و الم

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

عرض یا رب یہ مبتلی کی ہے کہ اب بخشش کر — رحم جز تیرے کرے کون گنہگاروں پر

سوئے عصیاں منگر بر کرم خویش نگر | پڑھ کے اس مطلع پُر درد کو روتے ہیں بشر

ظلم گوروں نے کیا اور نہ ستم کالوں نے
ہم کو برباد کیا اپنے ہی اعمالوں نے

ایضاً

یہ نئی ہے گردشِ چرخِ کہن | دشمن جاں ہے جفائے دل شکن
وہ بلا آئی گئی ہے دل پہ بن | اب نہیں ہے یارائے دم زدن

پابرہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

پہلے محشر سے قیامت آگئی | حشر کی سر پر مصیبت آگئی
لب پہ گردوں کی شکایت آگئی | جان پُر افسوں پر آفت آگئی

پابرہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

لٹ گیا اسباب چھوڑا اپنے گھر | اب ہے صحرائے مصیبت کا سفر
حال بد پر اپنے ہر دم ہے نظر | اس مصیبت کی نہ تھی اصلا خبر

پابرہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

مفلسی کی ہر طرف اب ہے پکار | مال کو روتے ہیں اپنے مالدار
غم ہی کھائے گے لیئے لیل و نہار | آب کی جا اشک دے ہے چشمِ زار

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

پاؤں میں جوتے نہ سر پر ہے کلاہ
ہے فلک کے ظلم پر سب کی نگاہ
تن ہے عریاں ساری خلقت ہے تباہ
خستہ دل اسد سے ہیں داد خواہ

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

ہے قیامت کا نمونہ دیکھ لو
بھائی کی بھائی کو کب ہے جستجو
کچھ نہ بیٹے کی خبر ہے باپ کو
باغِ عالم میں نہیں الفت کی بو

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

ترسشِ گل کی جا ہے بستر خار کا
صدمہ ہے اندوہ کے آزار کا
رنگ فق ہے ہر جگر افگار کا
دل فسردہ حال ہے بیمار کا

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

خوابہائے عیش کو کیا ہو گیا
کیا کیا تو نے یہ چرخ پُر جفا
یہ ہی افسانہ ہے کیا تھا کیا ہوا
یہ ستم تھا ای ستمگر کب روا

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

آہ بر لب چشم پُر نم زرد رو
ہے پریشانی قیامت موبمو

ہائے ہائے کی صدا ہی چار سو | خاک میں سب کی ملی ہی آبرو

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

شہر تھا یہ ثانیِ خلدِ بریں | اس چمن کے گل ہوئے صحرا نشیں
ہو گئی ویران دہلی کی زمیں | اس ستم پر دل ہی روتا ہی میں

پا برہنہ گھر سے نکلے مرد و زن
لوگ دہلی کے ہیں سارے نعرہ زن

ایضاً

ہوئے دفن جو کہ ہیں بے کفن اُنھیں رُوتا ابرِ بہار ہی
کہ فرشتے پڑھتے ہیں فاتحہ نہ نشان ہی نہ مزار ہی
نہ تھا شہر خلد سے بھی یہ کم سبھی جا خوشی تھی نہ تھا الم
چلی ایسی بادِ سموم و غم نہ وہ رنگ ہی نہ بہار ہی
کہو کیونکہ اپنی ہو زندگی کوئی جائے امن نہیں رہی
کہیں تیغ تیز کھنچی ہوئی کہیں پھانسی ہی کہیں دار ہی
پھرے دشت دشت تباہ سب بُرے دن دکھائے فلک نے اب
نہیں تھمتے اشک ہیں روز و شب یہی شغل ہی یہی کار ہی
نہ وہ لوگ ہیں نہ وہ انجمن جسے دیکھو غم میں ہی نعرہ زن
نہ وہ سیرِ باغ نہ وہ چمن جہاں گل تھے کثرتِ خار ہی

جو دو شالہ پوش تھے مثلِ گل جو لبوں پہ رکھتے تھے جامِ مل
بنے دشتِ غم کے ہیں خارِ گل نہ قبا ہی تن پہ نہ تار ہے

ہوئی تنگ امتِ مصطفےٰ نہیں اُٹھتا صدمہ عذاب کا
کہیں رحم جلد ہو یا خدا بُرے وقت کا تو ہی یار ہے

کہی وہ غزل ہے یہ اے ملیں جسے سن کے روتے ہیں مہ جبیں
وہ ہے کون جس کو کہ غم نہیں یہاں سب کا سینہ فگار ہے

مجروح میر مہدی مرحوم دہلوی

مرزا غالب کے محکم گردرشید تھے سنہ ۱۳۲۰ھ مطابق سنہ ۱۹۰۲ء میں انتقال ہوا ان کے والد کا نام میر حسین فگار تھا اپنے والد کے تخلص کی رعایت کو ملحوظ رکھ کر اپنا تخلص مجروح رکھا تھا۔

یہ کہاں جلوۂ جاں بخش بتانِ دہلی
کیونکہ جنت پہ کیا جائے گمانِ دہلی

ان کا بے وجہ نہیں لوٹ کے ہونا برباد
ڈھونڈتے ہیں اپنے مکینوں کو مکانِ دہلی

جس کے جھونکوں سے ہوا طبلۂ عطار ہنی
ہے وہ بادِ سحر عطر فشانِ دہلی

سمجھے ہیں سوئے ادب جنتِ ثانی کہنا
وہ کچھ اشخاص جو ہیں مرثیہ خوانِ دہلی

یہ ستم دیکھ چکے تھے کہ رہے آسودہ
فتنۂ حشر میں آفت زدگانِ دہلی

اس لیے خلد میں جانے کا ہر اک طالب ہے
کہ کچھ ایک دور سے پڑتا ہے گمانِ دہلی

ضربتِ رشتۂ بیدادِ ستم سے مجروح
صرفِ بیداد ہوئے منتخبانِ دہلی

محسن۔ حکیم محمد محسن خاں مرحوم دہلوی

دیارِ ہند میں یہ تخت گاہ تھی دہلی
ثریا جاہ فلک بارگاہ تھی دہلی
تمام شہروں کی پشت و پناہ تھی دہلی
گناہگار ہوئی بے گناہ تھی دہلی

یہ انقلابِ زمانہ سے ہو گئی برباد
اُکھڑ کے پھک گئی اب اس کی بیخ او بنیاد

یہ شہر وہ ہے کہ تھا افتخارِ ہفت اقلیم
محلِ پایۂ اورنگِ خسروانِ قدیم
شکوہ و رفعت و شوکت میں رشکِ عرشِ عظیم
فضا و حسن میں غیرت فزائے باغِ نعیم

خدا ہی جانے کہ اس پر لگی ہے کس کی نظر
ہر ایک قصبہ و قریہ سے ہو گیا کمتر

اسی کو کہتے تھے سب رشکِ خطۂ کشمیر
اسی کو کہتا تھا عالم مرقعِ تصویر
تھا جہان میں اس کا کوئی عدیل و نظیر
مہوسوں کے لیے جس کی خاک تھی اکسیر

کوئی تو ایسا ہی سرزد ہوا ہے اس سے قصور
مثالِ بختِ سیہ ہو گیا جو یہ بے نور

اسی سے ہو گئی اقلیمِ ہند کو زینت
اسی سے پائی ہر ایک اہلِ ہند نے عزت
اسی کو دیتے تھے سب باغِ خلد سے نسبت
اسی کی ہو رہی سارے جہان میں شہرت

جہاں میں ہو گیا یہ شہر اس قدر بدنام
یہاں سے چھوڑ کے جاتے ہیں لوگ اپنے مقام

وہ لعل قلعہ جسے کوہِ طور کہتے تھے
فضا کو جس کی فضلائے قصور کہتے تھے

وہ نازنین جنھیں رشکِ حور کہتے تھے — وہ شاہزادے جنھیں سب حضور کہتے تھے

رہا نہ کوئی حسین اور نہ کوئی وارثِ تخت
مٹانے تخت کو آیا تھا بخت خاں[١] کم بخت

وہ لال پردہ کہ بس پردہ پوشِ عالم تھا — وہ گویا پردۂ پر نورِ چشمِ آدم تھا
وہ مجرا گاہِ سلاطین و حاتم و جم تھا — وہ سجدہ گاہِ نریمان و زال و رستم تھا

تمام کھودتے پھرتے ہیں اس جگہ مزدور
ظہور اُس کا ہوا جو خدا کو تھا منظور

وہ تو محلہ کہ تھا رشکِ کوچہ و بازار — طواف کرتی تھی ہر صبح جس کا بادِ بہار
ہر ایک مکاں تھا مصفا بصورتِ گلزار — بنا تھا کوچہ ہر اک اُس کا مصر کا بازار

اب اُس محلّہ کا باقی رہا نہ نام و نشاں
نظر وہ قلعہ میں آتا ہے مثلِ گورستاں

وہ جنگلی ڈیوڑھی جو تھی رشکِ وادیٔ ایمن — کہ شمعِ طور تھی ہر ایک واں کی شمعِ لگن
مہک رہی تھی وہ پھولوں سے صورتِ گلشن — سجی ہوئی تھی حسینوں سے مثلِ صحنِ چمن

وہ دشتِ قیس کے مانند ہو گئی ویران
جرس کی آتی ہے آواز اُس جگہ ہر آن

ہوئی وہ ڈیوڑھی کی بنیاد اس طرح برباد — کہ گویا پھینک دی اُس کی اکھیڑ کر بنیاد
نشان بھی نہ رہا اُس کا اب کسی کو یاد — ہر ایک دیکھ کے بس اُس کو کرتا ہے فریاد

الٰہی کیا ہوئے اب یاں کے وہ مکان و مکیں
فلک اُٹھا کے کہاں لے گیا ہے یاں کی زمیں

[١] بریلی کے رسالہ کا افسر

وہ لال جوڑے پہن کر کوئی نکلتی تھی
وہ ہاتھ پاؤں میں مہندی کو اپنے ملتی تھی
وہ بانکپن سے اُٹھا پائنچوں کو چلتی تھی
وہ بات بات میں انداز سے مچلتی تھی

ہوئے ہیں رنج و تردد میں اب تو وہ محبوس
بجائے مہندی کے ملتے ہیں وہ کفِ افسوس

دکھانے اُن کو تبسم سے وہ لبِ اعجاز
مچل مچل کے دکھانا وہ اِن کا عشوۂ ناز
سُناتے اُن کو وہ شوخی سے نازکی آواز
نئی ادا سے دکھانا وہ چال کا انداز

یہ اُن کا ہو گیا ہے اب تباہی سے احوال
کہ ساری بھول گئے اپنی وہ ادا کی چال

کسی کے جعدِ معنبر میں نقرئی موباف
کروں میں محرم دکنی کے اُن کی کیا اوصاف
کسی کا چہرۂ پُرنور مثلِ آئینہ صاف
قلم کی طرح سے ہوتا ہے غم سے سینہ شگاف

نصیب اُن کو شب و روز اب ہے سینہ زنی
ملے ہے کھانے کو ہیرے کی بھی نہ اُن کو کنی

وہ لوگ بسترِ سنجاب پر جو سوتے تھے
تمام عمر کو لہو و لعب میں کھوتے تھے
سحر گلاب سے جو منھ کو اپنے دھوتے تھے
وہ بال بال میں موتی سدا پروتے تھے

اب اُن کا حال تباہی سے ایسا ابتر ہے
بچھونا خاک ہے اور خشت بالشِ سر ہے

جو گُندھے پھولوں کے پھرتے تھے پہنے گردن میں
سراپا محوِ تماشا تھے اپنے جوبن میں
اکڑتے پھرتے تھے مانندِ سرو گلشن میں
خوشی سے پھولے سماتے نہ جامۂ تن میں

ہوئے وہ اندنوں نانِ شبینہ کو محتاج

اگرچہ شیر سے تھے پر ہو گئے وہ روبہ مزاج

سحر نے اپنا گریباں کیا ہے غم سے چاک
ہے ہی نرگسِ بیمار بھی سدا غمناک
اُڑاتی پھرتی ہے سر پر صبا چمن میں خاک
پہن کے بیٹھی ہے سوسن بھی ماتمی پوشاک

بہارِ گلشنِ دہلی پہ آ گئی ہے خزاں
رہا نہ صفحۂ ہستی پہ ان کا نام و نشاں

ہر اک مکاں تھا یہاں رشکِ روضۂ رضواں
ہر اک کوچہ میں موجود عیش کا ساماں
ہر اک جواں تھا یہاں رشکِ حور اور غلماں
ہر اک مکاں میں رہتی تھی محفلِ خوباں

بجائے بلبل و طاؤس بولتے ہیں کلاغ
ہر اک مکاں میں ہے موجود آشیانۂ زاغ

ہر ایک کمرہ تھا روشن بسانِ برجِ حمل
یہ ہوتے ہی در و دیوار ان کے پر صیقل
مثالِ کاخِ مصور سجا ہوا ممتثل
نظر وہ آتی تھی جو چیز تھی ادھر اوجھل

نہ وہ حسین رہے اور نہ وہ مکان و مکیں
سڑک کے واسطے دلی میں رہ گئی ہے زمیں

ہر اک حکیم یہاں تھا ارسطوئے ثانی
ہر اک حسین یہاں رشکِ ماہِ کنعانی
ہر اک امیر کو تھا دعویِ سلیمانی
ہر اک فقیر کو حاصل تھا علمِ عرفانی

بسانِ نقشِ قدم ہو گیا ہر اک پامال
دیارِ ہند سے سب اُٹھ گئے ہیں اہلِ کمال

وہ رہتی تھیں دلی میں رنڈیاں جو حسیں
خجل تھا عارضِ روشن سے جن کے ماہِ مبیں
کوئی تھی حور شمائل کوئی تھی زہرہ جبیں
سرود و رقص سے پامال ان کے اہلِ زمیں

یہ انقلاب فلک سے وہ ہو گئیں ناچار
جہاں میں پھرتی ہیں آوارہ مثلِ گرد و غبار

بنے ہوئے تھے وہ چوپڑ کے چوک میں بازار
ہر ایک دیدۂ آئینہ روشن و ہموار
کہ جیسے چار چمن ہوں بسطحِ گلزار
خجل تھا جس سے خطِ عارضانِ گل رخسار

ہر اک دکان میں بیٹھا ہوا ہے فریادی
ٹپک رہی در و دیوار سے ہے بربادی

اور اس میں حوض تھا اک مثلِ چشمۂ کوثر
ضیا میں چشمۂ خورشید سے بھی روشن تر
بجائے آب وہ لبریز نور سے یکسر
صفا میں چادرِ مہتاب کا تھا وہ ہمسر

سراپا بھر دیا ہے اس میں خس و خاشاک
اٹا ہوا وہ پڑا ہے بمثلِ تودۂ خاک

یہ نہر دونوں طرف خوشنما تھی اس کی رواں
صفائے آب سے شرمندہ اس کے تھا نیساں
زمیں میں چھپ گیا خجلت سے چشمۂ حیواں
لبوں کو چاٹتے تھے پانی پی کے حور وشاں

ہوئی ہے فرطِ کدورت سے اب وہ خاک آلود
تمام خاک میں بس مل گئی ہے اس کی نمود

وہ موجیں اس کی لطافت میں مثلِ کاکلِ حور
چراغ اس کے فروزاں وہ مثلِ شعلۂ طور
حباب اس کے نمایاں بشکلِ قبۂ نور
بوقتِ سیر وہ تھی خاص و عام کی منظور

یہ کاوکاوِ زمانہ سے ہو گئی ہے خراب
کہ جیسے ماہی تڑپتی ہے خاک پر بے آب

یہ گرد بوقلموں اس کے کثرتِ اشجار
شگفتہ چار طرف گویا تختۂ گلزار

نثار ہوتی تھی ہر صبح اُس پہ بادِ بہار
ہجوم خلق سے رونق فزا وہ لیل و نہار
خزاں رسیدہ نظر آتا تھا ہر ایک شجر
ہر ایک برگ بنا اُس کا صورتِ محشر

سُناتے پھرتے تھے سقّے کٹوروں کی جھنکار
وہ گل فروشوں کے پھولوں کے ٹوکروں کی بہار
وہ سودا بیچتے تھے لوگ واں پکار پکار
وہ پھرنا خوانچہ والوں کا وہاں قطار قطار
رکھا تھا دہلی کا لوگوں نے نام عشق آباد
بسانِ خانۂ عاشق وہ ہو گئی برباد

جو نافِ شہر میں واقع تھی مسجدِ جامع
وہ حسن و وسعت و رفعت میں گویا تھی جامع
بسانِ برجِ حمل اُس کے برج تھے لامع
موذنوں کے فرشتے وہاں کے تھے سامع
نکیوں کہ ہووے جہاں میں وہ واجب التعظیم
بنی ہوئی ہے سراسر وہ شکلِ عرشِ عظیم

تھے اُس کے چار سو چوپڑ کے خوشنما بازار
خجل تھا جن سے خطِ عارضانِ گل رخسار
برنگِ بزم وہ آراستہ تھے لیل و نہار
سہ پہر کو تھی وہ گدڑی کی سیڑھیوں پہ بہار
فلک نے کر دیا ہر سمت اُس کے ویرانہ
بنا ہے ایک طرف اُس کے اب شفا خانہ

نمازی دیکھ کے ہر صبح اُس کو روتے ہیں
مدام چہروں کو اشکوں سے اپنے دھوتے ہیں
اسی کے رنج و تاسف میں جان کھوتے ہیں
نہ دن کو کھاتے ہیں نہ رات کو وہ سوتے ہیں
وہابی ہو گئے ہیں سارے اندنوں باہم
کسی کو رکھنے نہیں دیتے اُس جگہ پہ قدم

یہ شہر وہ ہے کہ تھے اس میں خلد کے ساماں
ہر ایک طفل یہاں کا تھا ثانیِ غلماں
ہر ایک شخص یہاں تھا بجائے خود رضواں
دبیرِ چرخ کا ہمسر تھا یاں ہر ایک جواں

رہا نہ کوئی جواں اور نہ کوئی پیرِ امیر
برائے مخبری کے رہ گئے ہیں چند شریر

اکڑ کے پھرنا جوانوں کا وہ سرِ بازار
کسی کے ہاتھ میں بانڈی کوئی لیئے تلوار
پہنکے ٹوپیاں زریں وہ باندھ کر دستار
کوئی تھا گھوڑا کودا تا کوئی تھا فیل سوار

نہ وہ جوان رہے اور نہ کوئی ہے خوشحال
رہے ہیں دہر میں اب کھانے والے ماش کی دال

مدام جنتی لوگوں کو رہتی ہے عسرت
عبث ہے منعموں کو نازِ سطوت و شوکت
کہ اُن کے واسطے حق نے بنائی ہے جنت
مثال سانپ کے پلٹے گی اُن کو یہ دولت

جو اہلِ دین ہیں اُن کے لیئے ہے باغِ نسیم
جو مشرکین ہیں اُن کو ملے گی نارِ جحیم

میں دردِ دل کہوں اب کس سے جا کے اے محسن
شبانہ روز ہوں میں مبتلائے رنج و محن
نہ کوئی یار رہا ہے نہ کوئی اہلِ وطن
مٹا ہے سامنے آنکھوں کے میری یہ گلشن

خدا کرے کہ یہ ہو جائے پھر چمن آباد
مثالِ گل کے ہوں باشندے یاں کے خرم و شاد

ایضاً

وہ پری چہرہ ہوئے قتل میانِ دہلی
ایسی آباد تھی کیا کیجے بیانِ دہلی
موت بھی جن کی ہوئی آفتِ جانِ دہلی
ہو گی جنت بھی نہ آباد بسانِ دہلی

بے نشاں ہو گیا عالم میں نشانِ دہلی
لامکاں بن گیا ایک ایک مکانِ دہلی

ملتا دیکھا جو بہت نقشہ یہاں کا ہم نے
ہو گیا روضۂ رضواں پہ گمانِ دہلی

نامِ خورشید ہے محشر میں دکھانے کو فلک
رکھتا ہے سینہ پہ یہ داغِ زیانِ دہلی

کیا کہیں ملکِ عدم میں یہیں سے جا کر
ہوئے جاتے ہیں جو معدوم مکانِ دہلی

پیرہن شکلِ زلیخا مہِ کنعاں ہیں جواں
خالی از حسن نہیں پیر و جوانِ دہلی

ابر سمجھو نہ اسے چھا گیا ہے گردوں پر
دودِ آہِ جگرِ سوختگانِ دہلی

غم و غصہ تو سدا کھاتے ہیں عشرت کے سبب
پیتے ہیں خونِ جگر بادہ کشانِ دہلی

ہوئیں بے خواب جو چشمانِ ملایک شاید
تا فلک پہنچ گیا شور و فغانِ دہلی

لوگ جب دہلی کو دیں خلد بریں سے نسبت
کہیں ہر پیر کو ہم کیوں نہ جوانِ دہلی

ہے کہاں کوچہ و بازار و محلہ باقی
خط پہ کیا خاک لکھوں نام و نشانِ دہلی

ادب آموزِ ملایک ہیں یہاں کے جاہل
رشکِ حورانِ بہشتی ہیں بتانِ دہلی

چشمۂ آبِ بقا نام تھا جس کا اب وہ
اشکِ حسرت سے بھری نہرِ روانِ دہلی

گھر لٹا مال لٹا جان گئی اب تک بھی
ہیں مصیبت میں مصیبت زدگانِ دہلی

وا ہیں آنکھیں پس از قتل بھی مقتولوں کی
تنِ بیجاں ہیں مگر ہیں نگرانِ دہلی

اب جو دلی ہوئی آباد تو کیا خاک ہوئی
جن سے زینت تھی کہاں ہیں وہ جوانِ دہلی

بسے سرسبز تھے عالم میں فرشتے آکر
لا کے دکھلاتے تھے رضواں کو مکانِ دہلی

کیوں نہ مطبوعِ جہاں یاں کی زباں ہو محسن
سب زبانوں کی خلاصہ ہے زبانِ دہلی

مہدی۔ سید مہدی حسین مرحوم دہلوی

رات دن لب پہ نہ ہو کیونکہ بیانِ دہلی
نہ مکیں اب وہ رہے ہے اور نہ مکانِ دہلی

بعض مقتول ہوئے بعضوں نے پھانسی پائی
نام کو بھی نہ رہے ہے پیر و جوانِ دہلی

شکوہ بے فائدہ کرتا ہے کسی کا ہمدم
تھا مقدر میں لکھا یونہیں زیانِ دہلی

نہیں بازارِ محبت میں خریدارِ دل
چھان ڈالی ہے ہر ایک میں نے دکانِ دہلی

نہ وہ اربابِ طرب ہیں نہ وہ ہیں اہلِ نشاط
ہاں نظر آتے ہیں کچھ مرثیہ خوانِ دہلی

غمزہ تھا آفتِ جاں اور قیامت قامت
عجب انداز کے تھے ماہ رخانِ دہلی

گھسکے صندل کا لگانا جنھیں تھا دردِ سر
دل پہ رکھتے ہیں وہ اندوہِ گرانِ دہلی

فرشِ گل پر جو جھجکتے تھے قدم رکھتے ہوئے
چلتے کانٹوں پہ ہیں وہ نازکنانِ دہلی

عرش پہ غش آئے اگر دیکھتے حضرت یوسف
ایسے انداز کے تھے کج کلہانِ دہلی

جھک گیا چرخ خجل ہو کے قدمبوسی کو
اس نے دیکھی تھی کبھی رفعتِ شانِ دہلی

ہوش جاتے رہے تھرا گئی نارِ دوزخ
پہونچی افلاک پہ جب آہ و فغانِ دہلی

خاک جل بھن کے تو ہو جائے گا چرخِ بدکیش
نالہ کرنے بیٹھے جو دل سوختگانِ دہلی

کچھ عجب نقشہ یہاں کا نظر آتا ہے مجھے
کیونکہ دلی پہ کیا جائے گمانِ دہلی

اور شہروں کو۔ کریں لاکھ تکلف لیکن
نہیں ہونے کی میسر یہ زبانِ دہلی

ہیں نئے رنگ نئے روپ جہاں کے مہدی
کفِ افسوس ہیں اور لالہ رخانِ دہلی

ہنرؔ۔ میرزا الٰہی مرحوم۔ دہلوی

تھے ہنرؔ ہم سببِ عظمت و شانِ دہلی
اس کو لازم ہے بیابانِ عدم سے تشبیہ
واہ کیا گرمیِ گفتار ہے سبحان اللہ
خلد سے آتے ملائک تھے خریداری کو
رفعتِ عرشِ معلّے سے بھی سبقت لے جائے
آہ اے پیرِ فلک دیکھ تری گردش سے
نام مٹنے کا نہیں حشر تلک ہووے گا
ساکنِ باغِ جناں رہتے تھے مشتاق اس کے
عدم آباد ہے برباد ہوئے سے یہ دیار
حوریں جنت کی جنھیں دیکھ کے پڑھتی تھیں درود

نزہے ہم نزہا نام و نشانِ دہلی
نہیں اس شہر پہ اب ہم کو گمانِ دہلی
شعلہ و برق و شرارہ ہے زبانِ دہلی
ایسی آباد تھی ہر ایک دُکانِ دہلی
لکھنے بیٹھوں ہیں اگر رفعت و شانِ دہلی
کس طرح قتل ہوئے پیر و جوانِ دہلی
گو فلک تو نے مٹایا ہے نشانِ دہلی
قصرِ جنت سے بھی بہتر تھے مکانِ دہلی
اب وہ مُردے ہیں جو بستے تھے میانِ دہلی
وہ حسیں حق نے بنائے تھے میانِ دہلی

ٹوٹ جاتا ہے دل انسان کا دہلی کی طرح
جب ہنرؔ ہم کبھی کرتے ہیں بیانِ دہلی

سوداؔ۔ ملک الشعرا مرزا محمد رفیع مرحوم دہلوی

مرزا محمد شفیع دہلوی کے صاحبزادے اور شاہ حاتم کے شاگرد تھے ۱۱۲۵ھ میں ولادت ہوئی۔ شاہ عالم کی بارگاہ سے ملک الشعرا کا خطاب ملا۔ لکھنؤ پہونچکر نواب آصف الدولہ کے دربار سے چھ ہزار روپیہ سالانہ کی جاگیر عطا ہوئی۔ نادر شاہ کا حملہ جو ۱۷۳۹ء میں ہوا اس سے قبل کی بدنظمی

اور بعد کے انقلاب سے متاثر ہو کر سودا نے جو نظم لکھی تھی وہ اس مجموعہ میں انقلابات دہلی سے متعلق ہونے کی بنا پر شامل کر دی ہے۔ سودا مرحوم کا انتقال بعمر ستر سال ۱۱۹۵ھ م ۱۷۸۱ء لکھنؤ میں ہوا وہیں دفن ہوئے۔ مطبوعہ کلیات ان سے یادگار رہی۔ ان کا مشہور شہر آشوب یہ ہے۔

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں ہے ڈانواڈول ۔۔۔ پھرے ہے جا بجا کہیں نوکر ہو لیکے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے کہ اس کے جواب میں دو بول ۔۔۔ اگر کہوں میں تو سمجھے گا تو کہ یہ ہے ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیر یوں یا تول

سپاہی رکھتے تھے نوکر امیر دولت مند ۔۔۔ سو آمد اُن کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند ۔۔۔ جو ایک شخص تھا بائیس صوبہ کا خاوند
رہی نہ اُس کے تصرف میں فوجداری کول

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف ۔۔۔ ٹکے کہاں جو ہمیں وے بکے ہوں اُنھوں سے حریف
جو عامل اب ہیں محالات کے سو یوں ہیں خفیف ۔۔۔ نکچھ ربیع میں حاصل نکچھ میان خریف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اوّل[1]

بس ان کا ملک میں کار نسق جو یوں ہو تباہ ۔۔۔ کہ کوہ زر ہو زراعت ہمیں تو نہیں پر کاہ
جگہ وہ کون سی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ ۔۔۔ کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگاہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی فقط عربی باجہ پر اُنھوں کی شان ۔۔۔ جو چاہیں اس کو نہ بجوائیں وہ تو کیا امکان
پر اُن کو فکر ہے تخفیف خرچ کا ہر آن ۔۔۔ رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندان
گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول

انھیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور ۔۔۔ کہ ہوں دو مورچھل اور ایک کا بنے طنبورہ

[1] ضمانت میں دیا ہوا آدمی

نہ رسم صلح کی سمجھیں نہ جنگ کے دستور
جو اُن میں قاعدہ داں تھے ہوئے وہ ایسے دور
تماشش ان کی طبیعت کا ہر طرح سے ٹٹول

امیر اب جو ہیں دانا اُنھوں کی ہے یہ چال
ہوئے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانہ کا حال
بچھی ہے سوزنی خوجا کھڑا بھلے ہے رومال
حضور بیٹھے ہیں دو اک ندیم اہلِ کمال
دھری ہے رو برو ایک پیکدان اک تنبول

جو کوئی ملنے کو اُن کے اُنھوں کے گھر آیا
ملے یہ اُس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکرِ سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا
اُنھوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا
خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لئے جمع ہوں صغیر و کبیر
تو ملک و مال کا فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پہونچنے کی بوجھی ہے بخشی کو تدبیر
کھڑا یہ اٹکلے دیوانِ خاص بیچ وزیر
کہ شامیانوں کے بانسوں پہ نقرئی ہیں خول

تجمل ہو یہ نہ سمائے زمیں بہت بھائی
گئے وہ مشورہ میں کھیلیں جو سوا[1] پائی
تمام عمر ہی تدبیر ملک میں کاٹی
ندان کر اُٹھے مل کر گھر اینٹ کا ماٹی
پھر اپنے زعم میں ہر اک برائے خود بہلول

پڑے جو کام اُنھیں تب نکلے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو موٹی پھرے لڑائی سے
پیادے وہ جو ڈریں سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑیں سوتے میں چارپائی سے
کرے جو خواب میں گھوڑا اُنھوں کے نیچے الول[3]

نہ صرفِ خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفترِ تن کی میں کیا کہوں خواری
سوالِ دستخطی کو پھاڑ کرکے پنساری

[1] انانہ کرے [3] اکیل [2] چھدنا گودنا۔

کسی کو آنولہ دے باندھ کر کسی کو کنٹول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار — تلاش کر کے ڈھلیتی[1] انھوں نے کی ناچار
ندان بنیوں کے دی قرض میں سپر تلوار — گھروں سے اب جو نکلتے ہیں لیکے وہ ہتھیار
بغل کے بیچ تو سوٹا ہے ہاتھ میں کچکول

کروں معاش کا حضرت کی تجھ سے کیا میں بیان — کہ توشہ خانہ ہے ان کا پرانچہ[2] کی دکان
نکل تنور کے منہ سے کہے ہے گاو زبان — بکی ہوں تب میں کہ جب تھا کاتبِ[3] خلدمکان
بکے ہے تیسرے فاقہ میں کوڑیوں کے مول

کہو جو مودی سے جا کہدو آپ کے حالات — جواب دے وہ کہ ہیں اب نٹ تو فرشتہ کی ذات
ہوا یہ جیسی ہے پیلوں کی اور بس پہ برات — جو خچریں ہیں انھوں نے پیا ہے آبِ حیات
تمھارے کھانے کو دانہ کہو تو دیجے تول

جو اصطبل میں کئی گھوڑے ہیں تو کیا امکان — کہ ہووے گھانس کے پتے کا ان کے آگے نشان
کسی کی ٹوٹی ہے ٹنگری کسو کا جھڑ گیا کان — طویلہ اس کو کہوں یا کہ پنج پیر کا تھان
اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانواں ڈول

اور اب جو زعم میں آقا کے فیل خانہ ہے — جو ہتنی اندھی ہے اس میں تو ہاتھی کانا ہے
نہ ٹھور چارے کا راتب کا نے ٹھکانا ہے — ہر ایک بھوک سے سوئے عدم روانا ہے
اب اس کو خواہ وہ پائل سمجھ لیں خواہ جھول

کریں ہیں بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش — کہیں پلاؤ تو باورچی دال پکا دیں آش
کریں قناتوں میں دربان بیٹھے پردہ فاش — تلے سے ان کے مسند کو کھینچ لیں فراش
اگر کہیں کہ مٹا اٹھ کے چاندنی کا جھول

[1] ہتھیار بند محافظ کا عہدہ [2] پرانے کپڑے بیچنے والا [3] نیشاپور کا مشہور شاعر اور خوشنویس

یہ خاندان محل کی ہے اندنوں صورت — نہ خوان دھونے کا کشمیرنی میں باقی ست
نہ اُٹھ کے ہلنے کی ہرگز نہ رونے کی طاقت — بنی ہے بھوک سے درباریوں کے منہ کی گت
کہ بوڑھی ہتنی کے جس طرح بیٹھ جائیں کپول

بچارکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ — کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریباں پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آوے دے مارتا ہے کواڑ — کوئی کہے جو ہم ایسے ہی چھاتی کے ہیں پہاڑ
تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجے گھول

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا — کہ بے زری نے گھرا ایسا جب آنکر گھیرا
تو کوئی قصد کرے نوکری کا بہتیرا — نہیں ہے فائدہ کچھ تا وہ چھوڑ کر ڈیرا
کرے نہ عزم سوئے اصفہان و استنبول

جو نوکری ہے کہیں زیرِ چرخِ نیلی فام — سو جائداد کا اُس کی ہے پرگنہ نیلام
وبا کا جیسے ہے دارالخلافہ میں ہنگام — گھروں کی ضبطی کا حکم اس قدر ہوا ہے عام
ادھر کسی کا دُکھا سر اُدھر سے دوڑی قول[1]

سو کیا وہ نوکری کٹتی ہو جس میں یہ اوقات — ملے ہے پیٹ کو روٹی سو رو رو آدھی رات
جو چاہیں تن ڈھپے اس میں سو آگے پیچھے پات — اور اُس پہ یہ ہے کہ ہر روز ٹھہرے موجودات
جو پانچوں باندھیے ہتھیار اور چھٹی پستول

وہ نوکر اب جسے آقا ہر آن پہچانے — جو پوچھو اُس سے کہ تم کچھ روپے لگے پانے
کہے ہے آہ وہ بھر کر سوائے آٹھ آنے — روپیہ کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے
کہ اس زمانہ میں چپٹا بنے ہے وہ یا گول

غرضکہ جب کہیں ملتا ہو پاؤ بھر بھی چون — کرے وہ نوکری جس کو کہ ہووے خبط و جنون

[1] سپاہیوں کی بھیڑ

یہ سمجھو کہ نہیں جب سے گری کے فنون — نئے تو سیکھ کے یوں باندھنے لگے مضمون

زمانہ دیکھ کے ہتھیار ہم نے ڈالے کھول

سخن جو شہر کے دہلانے سے کروں آغاز — تو اس کو سن کے کریں ہوش جنید کے پرواز

نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز — کوئی جو شام کو مسجد میں جائے بہرِ نماز

تو واں چراغ نہیں ہے بجز چراغِ غول

کسی کے یاں نہ رہا آسیا سے تا بہ اجاغ — ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ

سو کیا چراغ وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ — اور ان مکانوں میں ہر سمت رینگتے ہیں لاغ

جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر ہنڈول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس — کہ جن کے دیکھے سے جاتی تھی بھوک اور پیاس

اور اب جو دیکھو تو دل ہووے زندگی سے اداس — بجائے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

کہیں ستون پڑا ہے کہیں پڑے مرغول

یہ باغ کھا گئی کس کی نظر نہیں معلوم — نجانے کس نے رکھا یہاں قدم وہ کون تھا شوم

جہاں تھے سرو و صنوبر وہاں اُگے ہے زقوم — مچی ہے زاغ و زغن سے اب اُس چمن میں دھوم

گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

رکھیں تھے سیر یہ پنگھٹ کے گرد کے دیہات — کہ لب جہاں کی تھے پنہاریوں کے آبِ حیات

اور اُن درختوں کی وہ چھائیں اور گھنے سے پات — نہ وہ درخت ہیں اب واں نہ آدمی کی ذات

کوئیں میں مردے پڑے ہیں نہ ریسمان ہے نہ ڈول

جہان آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا — مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا

کہ یوں اُٹھا دیا گویا کہ نقشِ باطل تھا — عجب طرح کا یہ بحرِ جہاں میں ساحل تھا

کہ جس کی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی واں نہیں روشن تھے جس جگہ فانوس ۔ پڑے ہیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس
کروڑ دل پُر از اُمید ہو گئے مایوس ۔ گھروں سے یوں نجبا کے نکل گئے ناموس
ملی نہ ڈولی اُنھیں جو تھے صاحبِ چڑ دول

نجیب زادیوں کا ان دنوں ہے یہ معمول ۔ وہ برقع سر پہ ہے جس کا قدم تلک ہے طول
ہے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول ۔ اور اُن کے حسنِ طلب کا ہر ایک سے یہ صول
کہ خاکِ پاک کی تسبیح ہے جو لیجئے مول

اگر محب ہوا وہ مستمع تو سُن یہ نام ۔ دیا کچھ اُس نے بمقدور کر کے نذرِ امام
پڑا جو شامتِ طالع سے خارجی سے کام ۔ دروغ و راست کا لایا وہ درمیان کلام
یہ آگئے اور چلیں کہہ کے زیر لب لاحول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر ۔ کروڑ مرتبہ خاطر میں گذرے ہے یہ لہر
جو تاک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردشِ دہر ۔ تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردمِ شہر
گھروں سے پانی کو باہر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ہو سودا کہ آگے تاب نہیں ۔ وہ دل نہیں ہے کہ اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ہوگی کہ وہ پر آب نہیں ۔ سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ہے اک طرح کا زیادہ نہ بول

ایضاً

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے ۔ دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو ۔ اللہ رے اللہ رے کیا نظمِ بیاں ہے

اتنا میں کیا عرض کہ فرمائیے حضرت — آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یاں ہے
سنکر یہ لگے کہنے کہ خاموش ہی رہ جا — اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ میں کئی شکل — ہے وجہ معاش اپنی سوجس کا یہ بیاں ہے
گھوڑلے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالمِ بالا پہ نشاں ہے
گذرے ہی سدا یوں علف و دانہ کی خاطر — شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیئے کے ہاں ہے
ثابت ہے جو گلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال — تیروں میں ہے پرگیری تو بے چلّہ کماں ہے
کہتا ہے نفر غرّہ کو صراف سے جاکر — بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے
یہ سُن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ — شوال بھی پھر ماہِ مبارک رمضاں ہے
اس رنج سے جب چڑھ گئے چھتیس مہینے — تنخواہ کا پھر پیٹنا اس شکل سے یاں ہے
لیتے ہیں بایں رو یہی وہ تو دو ماہہ — ٹاٹ ڈھونس دھڑکّے کی جنھیں تاب و تواں ہے
قاضی کی جو مسجد ہے گدھا باندھکے اُس میں — بیٹھا ہوا اس شکل سے ہر پیر و جواں ہے
ملا جو اذاں دیوے تو منہ موند کے اس کا — کہتے ہیں کہ خاموش مسلمانی کہاں ہے
بولا جو خطیب اس میں تو ماری اسے اک دھول — ہاتھ آگیا واعظ تو تھپیڑا اُو وہاں ہے
رینکے ہے گدھا آٹھ پہر گھر میں خدا کے — نے ذکر نہ صلوٰۃ نہ سجدہ نہ اذاں ہے
اور وہ ہیں جو کمزور وہاں آن کے بیٹھیں — ریتی کے جو آگے کی وہ ہر ایک دکاں ہے
اُٹھ اُٹھ کے دکھاتے ہیں اُنھیں حال وہ اپنا — دربار رَو[۱] اس عہد میں جو خورد و کلاں ہے
یوں بھی نہ ملا کچھ تو ہر اک پالکی آگے — اس وجہ سے رسالہ کا رسالہ ہی رواں ہے
کوئی سر پہ کیئے خاک کوئی چاک گریباں — کوئی روئے ہے منہ پیٹ کوئی نعرہ زناں ہے
ہندو و مسلماں کو پھر اُس پالکی اوپر — ارتھی کا توہّم ہے جنازے کا گماں ہے

۱؎ دربار میں جانے والا۔

یہ مسخرہ کی دیکھ کے جا صاحبِ[1] ارتھی
کرتے ہیں جو واں عرض تو نے ناو نہ ہاں ہے

گر ہو جیے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب
اس کی تو اذیت بھی ہی آفتِ جاں ہے

وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں وہ زانو
کیسا ہی اگر اپنے تئیں خوابِ گراں ہے

بے وقت خورش اس کے جو ہو اپنے تئیں ٹھوک
سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے

گھڑیال کی جب بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں
اور پیچ خلا و دن میں جو اسپ دواں ہے

خمیازہ پہ خمیازہ ہے اور ریت[3] و پہ حرکت
ہو شہ صورتِ سوفار کمر تنگ کماں ہے

صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر
سو دو سو روپیہ کا جو کسی عمدہ کے ہاں ہے

صحبت ہے یہ اُس سے اگر آقا کے تئیں چھینک
آوے۔ تو وہ اُس کو بخشونت نگراں ہے

دیتے ہیں منگا تیر و کماں ہاتھ میں اُس کے
ٹھنڈی ہوا آنے کا گر اُس وقت گماں ہے

اور ماحضر اور پر جو وہ نواب کو دیکھے
کھانا تو یہ کھاتے ہیں کہ اُس کو خفقاں ہے

مطبوخ میں ہے خربزہ اور خربزہ پر دودھ
ہے دودھ پہ مچھلی نفس او برگا و زباں ہے

یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی سے ہو تسلی
اس سب پہ تفنن کے لیئے بیسنی نان ہے

اس میں جو کہیں درد اُٹھا پیٹ میں اُس کے
پھر بو علی سینا ہے تو وہ ہیچمداں ہے

رکھتے ہیں غرض مرگ کے لڑنے کو سپاہی
گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے

سوداگری کیجے تو ہے اس میں یہ مشقت
دکھن میں بکے وہ جو خریدِ صفہاں ہے

ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیئے منزل
ہر شام یہ دل وسوسۂ سود و زیاں ہے

لے جا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس
یہ درد جو سُنیئے تو عجب طرفہ بیاں ہے

قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث
سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے

جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق
پھر پیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے

[1] پالکی سوار [2] دربار میں [3] انگڑائی

پروانہ لکھا کر گئے عامل کئی جس وقت
اور دست پھر آئے تو کہا جنس بھی لیجا
ہر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس
ناچار ہو پھر جمع ہوئے قلعہ کے آگے
دو بیل کی جا کر جو کہیں کیسے کھینچتی
ہیں خشکی و تری کے نظر میں شب و روز
گر خان و خوانین کی سے کوئی وکالت
ہر عمدہ کے دروازہ پہ زیب پوش ہو بیٹھا
ہر گھر میں وہ چاہے کہیں فوارہ سا چھوٹوں
دیوان کے بخشی کے بیوتانت کے حاضر
ہر بات پلٹتا ہی ہے صبح سے تا شام
لاوے جو کچہری سے وہ داموں کا سیاہا
سو ماہی ہے بیٹھی ہی ولے پانسو ہے خرچ
بُتّا وے غرض پیسے اُڑا کر ہوا روپوش
جس وقت سُنا یہ وہیں آواز بدل کر
پھر ہو جو موکل سے کہیں راہ میں بھیٹا
عرضی پہ ہوا ہیم سیاہے پہ ہوا جسیم [۱]
کاہے کی غرض عرضی ہے کاہے کا سیاہا
انصاف جو کیجے تو نہیں اُس کی بھی تقصیر

کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
دیوان بیوتانت ہے کہتے ہیں گراں ہے
ہر اک متصدی سے میاں اور بتاں ہے
جو پالکی نکلے ہے تو فریاد و فغاں ہے
اور مینہ بھی موافق ہی پڑے پھر تو سماں ہے
نے امن ہے دل کے تئیں نے جی کو اماں ہے
اس کا تو بیاں کیا کروں تجھ سے کہ عیاں ہے
پوچھے ہے کہ اجی مرد ہے جی نواب کہاں ہے
ہر کوچہ میں جوں آب چکا بود وہ دواں ہے
مانند کنہیا کے جہاں دیکھو تہاں ہے
ہیل کے پتوے کی طرح منہ میں زباں ہے
للچاوے موکل کو یہ کیا خوب مکاں ہے
اور زر کے اجارے کی بھی اک دو دکاں ہے
گھر جا کے پکارا جو کوئی لالہ کہاں ہے
آپ ہی کہا گھر میں سے کشن چند کے یہاں ہے
اسناد کا جاگیر کی یہ اس سے بیاں ہے
پروانہ میں تم پہ ہوں تصدق مری جاں ہے
کیدھر کا وہ پروانہ وہ جاگیر کہاں ہے
سب ماحصل ان باتوں کا اک ہیچ نہاں ہے

[۱] یعنی عرضی پر رقم لکھی گیا لیکن منظور ہو گئی اور رقم سے سیاہا جاری ہو گیا۔

شاعر جو سُنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال
مشتاقِ ملاقات انھوں کا کس و ناکس
گر عید کا مسجد میں پڑھیں جا کے دوگانا
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر
اسقاط حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا
ملّائی اگر کیجیے تو ملّا کی ہے یہ قدر
اور ما حضرا خوند کا اب کیا میں بتاؤں
دن کو تو وہ بیچارہ پڑھا یا کرے لڑکے
تسپر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اُس کی
بھلگے یہ عمل کر جو وہ شیطان کا لشکر
اب کیجیے انصاف کہ جس کی ہو یہ اوقات
جس روز سے کاتب کا لکھا حال ہیں تب سے
وہ بیت ٹکے سیکڑا لکھنے کو ہے محتاج
یہ بھی میں تکلف ہی سے کہتا ہوں وگرنہ
احیا ہو جو موتی[1] کا زمانے میں نئے سر
ہدیہ ہو سوا پانچ ٹکے گزری میں آکر
دمڑی کو کتابت لکھیں دھیلے کو قبالہ
چاہے جو کوئی شیخ نے بہر فراغت
دیتا ہے دُرم خرسے کوئی شملہ کو نسبت

دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یاں ہے
ملنا انھیں اُس سے جو فلاں ابن فلاں ہے
نیت قطعِ تہنیتِ خانِ زماں ہے
گر رحم میں بیگم کے سنے نطفہ خاں ہے
پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے
ہوں دور دپیہ اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
نایاب کا سہ دال عدس جو کی دو ناں ہے
سب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے
دیوالی کو لے ہاتھ تعاقب میں دواں ہے
آرام جو چاہے وہ کرے وقت کہاں ہے
ہر صفحۂ کاغذ پہ قلم اشک فشاں ہے
خوبی میں خط اب جس کا بہ از خطِ بتاں ہے
آفاق میں ان چیزوں کی اب قدر کہاں ہے
خطاط کی اتنی بھی رہی قدر کہاں ہے
یا قوت[2] پکارے جو بکاؤ یہ قراں ہے
بیٹھے ہوئے واں میر علی چوک جہاں ہے
جھڈتے ہی تو شعرا کا وہ مطعونِ زماں ہے
گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے

[1] خوش نویس کا نام   [2] یاقوت رقم

اور اُس کو جو دیکھے کوئی وہ بہرِ معیشت — اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زناں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اُٹھ کر — ہے آج کدھر عرس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر ڈاڑھی کو کنگھی — لے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو واں سب کو ہوا وجد — کوئی کودے کوئی رووے کوئی نعرہ زناں ہے
گرتال سے پڑتا ہے قدم تو بھی ہنس ہنس — کہتے ہیں کوئی حال ہے یا رقصِ زناں ہے
اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو — ڈالا ہوا اس دال نخود قلیہ و ناں ہے
سب پیشوں کو تجکر جو کوئی ہو متوکل — جورو تو یہ سمجھے ہے نکھٹو یہ میاں ہے
اور بیٹے کے دل کو ہے خرافت کا تیقن — بیٹی کو جنوں ہونے کا بابا کے گماں ہے
جب دیکھا کہ اب لڑکے لگے بھوک سے مرنے — ہر خان و خوانین کے ہمراہ دواں ہے
جب راہ خدا پیسے نکالے کوئی نواب — تب اُن کی سفارش میں لیے رقعہ خواں ہے
مضموں ہے یہی رقعہ کا کچھ دیجئے اس کو — مداح اماموں کا ہے اور مرثیہ خواں ہے
بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری — یہ شکل کبھی مت سمجھیو تو راحتِ جاں ہے
تاک دیکھ لے منصور علی خان کا احوال — چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر دہاں ہے
آرام سے کتنے کا سُنا تو نے کچھ احوال — جمعیتِ خاطر کسی صورت سے کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام — عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے — یہ بات بھی گویندہ ہی کا محض گماں ہے

یاں فکر معیشت ہے وہاں دغدغہ حشر
آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

ایضاً

باغِ دہلی میں جو ایسا دور ہوا میرا گزر — نہ وہ گل ہی نظر آیا نہ وہ گلشن نہ بہار

نخل ہیں جھڑے ہوئے اور سوکھی پڑی ہیں شاخیں — خاک اُڑتی ہے ہر اک طرف پڑے ہیں خس و خار

مسکراتا تھا جہاں غنچہ و گل ہنستا تھا — اشکِ شبنم کے بھی قطرے کے نہیں واں آثار

جس جگہ جلوہ نما رہتے تھے سرو و شمشاد — مشت پر قمری کے اس جا نظر آئے یک بار

دیکھتا کیا ہوں مگر سوکھی سی اک شاخ اوپر — عندلیب ایک ہے بے بال و پر و دل افگار

بدمِ سرد و بصد حسرت و صد سوزِ جگر — دیکھ کر سوئے چمن کہتی ہے با نالۂ زار

حیف در چشم زدن صحبتِ یار آخر شد
روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد

تمام شد

صحت نامہ اغلاط

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴	۱۷	جائے افسوس	ہائے افسوس
۵	۱	کہول حال	کہوں حال
"	۱۱	یاد خزاں	بادِ خزاں
"	۱۵	جور فلک	جورِ فلک
۶	۳	سچ توبتا	سچ توبتا
"	۱۲	ہنوا	نہ ہوا
۱۱	۱	نہ نشان	نہ شان
۱۴	۲	نہ چھوئے	نہ چھوڑے
۲۱	۱۴	نہ مٹاٹا	نہ مٹانا
۲۴	۱۱	کانوں پہ	کانٹوں پہ
۲۵	۱۴	اٹھاس	اٹھائیں
۲۶	۱۸	کہ ہیں	چھوئیں جو
۲۸	۱۲	الگ ہی	ایک ہی
۳۴	۱	سے پہلے (ایضاً) نہیں لکھا ہے	(ایضاً) ہونا چاہیے
۳۴	۱۳	صفمان دہلی	صفہان دہلی

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۵۰	۹	بیان دھلی	میان دہلی
"	۱۷	صغیر	صغیر مرحوم
۵۶	۵	ظہور الدین	ظہیر الدین
۶۱	۹	ازوال	زوال
۶۶	۱۰	نازمیناں	نازنیناں
۷۲	۷	عزوقار	عزو وقار
۸۱	۴	روزشب	روز وشب
۸۱	۱۳	فرشتول	فرشتوں
۸۱	۱۴	چاندنی چوکِ	چاندنی چوک
۸۵	۸	" "	کوکب مرحوم جناب تفضل حسین شاگرد غالب مرحوم دہلوی
۱۰۱	۶	عشوۂ ناز	عشوۂ وناز
۱۰۲	۱۸	دملی	دہلی
"	۷	رندیاں	رنڈیاں
۱۱۶	۵	رودن	رودوں

نوٹ [illegible]

[illegible]

۱۔ اردو کی مجلس اعلیٰ [illegible] مجلس انتظامی [illegible]

۲۔ [illegible]

۳۔ طالب علموں [illegible]

[illegible]

۵۔ [illegible] کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو [illegible] ذمہ داری عائد ہوگی۔

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان سیاہی یا پنسل سے [illegible]

۸۔ قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں [illegible] جا سکتی [illegible]